بیان خسرو

حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ کی سوانحعمری اور اُنکے کلام پر
محققانہ ریویو

از شمس العلماء مولوی شبلی نعمانی (مرحوم)

جسکو کارپردازان الناظر بک ایجنسی لکھنؤ نے براے نفع
برخوردار اسمٰعیل سلمہٗ

الناظر پریس واقع لکھنؤ میں طبع کیا

مولانا شبلی کی مشہور تصانیف

سیرۃ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم

جسکی ترتیب، تیاری و طباعت کے لیے علیا حضرۃ بیگم صاحبہ بھوپال نے بیش قرار مستقل وظیفہ عطا فرمایا، جلد اول بکمال آب و تاب چھپکر شایع ہوگئی ہے۔ قیمت باختلاف کاغذ و نقشہ جات

مجموعۂ کلام شبلی

یعنی مولانا شبلی کا اُردو کلام۔ اس مجموعہ میں ایک مثنوی، کثیر التعداد نظمیں، متعدد غزلیات، قطعات وغیرہ غرضکہ جملہ اصناف کا کلام ہے قیمت ۱۲؍

مثنوی صبح امید

مولانا شبلی کی سب سے پہلی اُردو نظم قیمت ۴؍

شعر العجم

فارسی شاعری کی تاریخ جس میں شاعری کی ابتدا عہد بعہد کی ترقیوں اور اُنکے خصوصیات اور اسباب سے مفصل بحث کی گئی ہے اور اسی کے ساتھ تمام مشہور شعرا کا مفصل تذکرہ اور انکی شاعری پر تقریظ اور تنقید ہے۔ قیمت جلد اول ۔ جلد دوم ۔ جلد سوم ۔ جلد چہارم ۔

الفاروق - حضرت عمرؓ کی سوانحعمری

الغزالی - امام غزالیؒ کے سوانحی حالات

سیرۃ النعمان - حضرت امام ابو حنیفہ کی سوانحعمری

المامون - مامون الرشید کی سوانحعمری

سوانحعمری مولانا روم **بیان خسرو** ۸؍

علم الکلام - حصہ اول حصہ دوم

رسائل شبلی - ۱۱ مضامین کا مجموعہ

مقالات شبلی - ۱۲ مضامین کا مجموعہ

آغاز اسلام - حضور سرور کائنات کے مختصر حالات ۲؍

مضامین عالمگیر - اورنگ زیب کے معترضین کے جوابات ۱۰؍

کتبخانہ اسکندریہ - اس مشہور کتبخانہ کی بربادی کے ذمہ دار مسلمان کہے جاتے تھے اس الزام کی تردید۔ ۶؍

زیب النساء بیگم ۱؍ **جہانگیر** ۲؍

اسلامی حکومت اور ہندوستان کے تمدن پر اسکا اثر ۲؍

موازنہ انیس و دبیر ۔ ۔ ۔

الانتقاد - علامہ جرجی زیدان مصری کے مضمون تنقید عربی زبان میں ۔ ۔ ۔ ۴؍

دیوان شبلی - فارسی ۸؍ **دستہ گل** - فارسی ۴؍

بوئے گل فارسی ۴؍ **برگ گل** فارسی ۴؍

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بیانِ خسرو

ترکوں کا ایک قبیلہ لاچین کے لقب سے مشہور ہے۔ حضرت امیر خسرو[1] اسی قبیلے سے ہیں۔ انکے والد کا نام سیف الدین محمود ہے۔ ترکستان میں ایک شہر کش ہے وہاں کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے۔ فرشتہ اور دولت شاہ نے لکھا ہے کہ یہ لاچین کے امراء میں سے تھے چنگیز خاں کا فتنہ جب اٹھا تو سیف الدین ہجرت کر کے ہندوستان میں آئے اور سلطان محمد تغلق کے دربار میں ایک

ف۱ حضرت امیر خسرو کا حال تمام تذکروں میں کم و بیش تفصیل سے پایا جاتا ہے۔ تاریخ فرشتہ میں [illegible] لیکن خود امیر صاحب نے غرۃ الکمال کے دیباچہ میں جو مختصر حالات لکھے ہیں وہ سب [illegible] امیر صاحب کی [illegible] [illegible] حضرت امیر خسرو کی تصنیفات سے [illegible] مرتب کیے [illegible] ہے۔

بڑے عہدہ پر مامور ہوئے۔ محمد تغلق اِن کی نہایت قدرومنزلت کرتا تھا۔ ایک مہم میں کفار سے لڑکر شہید ہوئے۔

لیکن صاحب بہارستان سخن، تاریخی استدلال سے اس واقعہ کا ناممکن ہونا ثابت کرکے لکھتے ہیں،

"پس آنچہ دولت شاہ در تذکرۂ خود نوشتہ کہ پدر امیر خسروؒ در عہد سلطان محمد تغلق شہید شدہ و امیر خسرو را در حق وے قصائد عزا است خلاف صریح و محض غلط است غالباً شاہزادۂ سلطان محمد شہید را کہ حاکم ملتان بود و بعلت اشتراک اسمی محمد تغلق خیال کردہ۔"

بہرحال سیف الدین کے تین بیٹے تھے، اعزالدین علی شاہ، حسام الدین، اور امیر خسرو، سیف الدین کے انتقال کے وقت امیر صاحب کی عمر[1] ۷ برس کی تھی۔ امیر صاحب کی والدہ عماد الملک کی بیٹی تھیں جو مشہور امرائے شاہی میں تھے، اور دس ہزار فوج کے افسر تھے۔ امیر صاحب ۶۵۱ھ میں بمقام پٹیالی[2] پیدا ہوئے، قدیم خوش اعتقادی نے یہ روایت پیدا کی کہ جب وہ پیدا ہوئے

[1] والہ داغستانی اپنے تذکرہ میں لکھتے ہیں کہ امیر خسرو، باپ کے ساتھ غزنین کے اطراف سے ہندوستان میں آئے، اور پھر لکھتے ہیں کہ بعض یہ بھی کہتے ہیں کہ امیر خسرو کی ماں حاملہ آئی تھیں، خسرو دہلی میں پیدا ہوئے لیکن پہلی روایت بظاہر صحیح ہے۔" تمام واقعات تاریخی سے ثابت ہے کہ خسرو ہندوستان ہی میں پیدا ہوئے لیکن والہ داغستانی کو کیونکر گوارا ہوسکتا ہے کہ ہندوستان کی خاک سے ایسا شخص پیدا ہو۔

[2] پٹیالی ضلع ایٹہ کمشنری آگرہ میں چھوٹا سا قصبہ ہے پہلے یہی مقام ضلع کا صدر تھا، اب ایٹہ ہے، کسی زمانہ میں دریائے گنگا اس کے نیچے بہتا تھا، لیکن اب میلوں کا فاصلہ ہے۔ یہاں اب اسٹیشن بھی ہے۔ ۱۲

تو امیر سیف الدین ایک خرقہ میں لپیٹ کر ایک مجذوب کے پاس لیگئے، مجذوب
نے دور ہی سے دیکھکر کہا کہ وہ شخص آتا ہے جو خاقانی سے بھی دو قدم آگے
جائیگا۔ مجذوب صاحب کے کمالات کا ہم انکار نہیں کرتے، لیکن انکے شاعرانہ ذوق
کا تسلیم کرنا مشکل ہے، خاقانی کو امیر خسرو سے کیا نسبت۔

جب انھوں نے ہوش سنبھالا تو انکے والد نے انکو مکتب میں بٹھایا اور
خوشنویسی کی مشق کے لیے مولانا سعد الدین خطاط کو مقرر کیا لیکن امیر صاحب
کو پڑھنے لکھنے کے بجاے شعرگوئی کی دھن رہتی تھی، جو کچھ موزون ناموزون کہ
سکتے تھے کہتے تھے اور وصلیوں پر اسی کی مشق کرتے تھے۔ خواجہ اصیل کوتوال
کے نائب تھے، وہ کبھی کبھی سعد الدین خطاط کو خطوط وغیرہ لکھوانے کو بلا لیا کرتے
تھے۔ ایک دن بلایا تو امیر صاحب بھی ساتھ گئے۔ خواجہ اصیل کے مکان پر
خواجہ عزیز الدین بھی تشریف رکھتے تھے۔ سعد الدین نے خواجہ صاحب سے
کہا کہ یہ لڑکا ابھی سے کچھ خیال کرتا ہے، معلوم نہیں کہ موزوں بھی کہتا ہے یا
نہیں، آپ ذرا اسکے کلام کو سن لیجیے۔ خواجہ عزیز کے ہاتھ میں اشعار کی بیاض
تھی، امیر صاحب کو دی کہ کوئی شعر پڑھو، امیر صاحب نے نہایت خوش الحانی
سے پڑھا، چونکہ آواز میں قدرتی تاثیر تھی، لوگوں پر اثر ہوا، سب کی آنکھیں
بھر آئیں، اور سب نے بے اختیار تحسین کی۔ انکے استاد نے کہا شعرگوئی میں
امتحان لیجیے۔ خواجہ عزیز الدین نے چار بے جوڑ چیزوں کا نام لیا کہ انکو ملاکر شعر کہو
مو، بیضہ، تیر، خربزہ، امیر صاحب نے برجستہ کہا،

ہر موے کہ در دو زلفۂ آں ضنم است[1]　　　صد بیضۂ عنبریں بر آں موے صنم است

[1] جس نسخہ سے یہ رباعی نقل کی ہے وہ غلط تھا میں نے اسی طرح نقل کر دیا۔

چوں تیر براں راس دلش را زیرا کہ — چوں خربوزہ دندانش درونِ شکم است

خواجہ عزیز الدین کو سخت حیرت ہوئی، پوچھا نام کیا ہے؟ اُنھوں نے کہا خسرو، باپ کا نام پوچھا انھوں نے اصل نام کے بجائے قبیلہ کا نام بتایا، یعنی لاچین، خواجہ صاحب نے ظرافت سے کہا لاچین یعنی "چین نہیں" پھر کہا "ترک خطا ست" یعنی اُنکو ترک کہنا خطا ہے؟ انھوں نے اسی لفظ کو اُلٹکر کہا "بے خطا ترک است" یعنی قطعاً وہ تُرک ہے، خواجہ صاحب نے کہا چونکہ تمکو دربار سلطانی سے تعلق ہے اسلیئے تمکو سلطانی تخلص کرنا چاہیئے، چنانچہ تحفۃ الصغر[1] کی اکثر غزلونمیں یہی تخلص ہے،

امیر صاحب کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ عربی کی تحصیل تمام تھی لیکن تذکرہ نویسوں نے اسکے متعلق کچھ تفصیل نہیں لکھی، تاہم یقطعی ہے کہ ۱۵، ۲۰ برس کی عمر میں یہ تمام درسی علوم و فنون سے فارغ ہو چکے تھے،

درباری تعلقات امیر خسرو صاحب سن رشد کو پہونچے تو دلّی کے تخت پر سلطان غیاث الدین بلبن صدر نشین تھا، جو ۶۶۴ھ میں تخت حکومت پر بیٹھا تھا، اِسکے امرائے دربار میں سے کتلوخاں معروف بہ چھجو[2] بہت بڑے رتبہ کا سردار تھا وہ سلطان

[1] یہ تمام حالات اپنے امیر صاحب نے خود تحفۃ الصغر میں لکھے ہیں،

[2] چھجو خاں کا نام تاریخوں میں اس طرح مختلف لقب و خطاب سے آتا ہے کہ دھوکا ہوتا ہے کہ ایک شخص ہے یا کئی ہیں، امیر خسرو غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھتے ہیں کہ میں نانا کی وفات کے بعد سب سے پہلے خان معظم کتلوخاں عرف چھجو کے دربار میں پہونچا، اس سے اسقدر ثابت ہوا کہ کتلو اور چھجو ایک ہی شخص ہیں، بدایونی (صفحہ ۱۵۸ جلد اوّل) میں ہے کہ چھجو آخر میں کڑہ مانک پور کے ساتھ سامانہ کا حاکم مقرر ہوا تھا، اور سلطان معزالدین کیقباد نے اس کی بیٹی سے شادی کی تھی، فرشتہ میں لکھا ہے کہ علاء الدین محمد

کا بھتیجا اور باربکی کے عہدے پر مامور تھا۔ **فرشتہ** میں لکھا ہے کہ مجلس آرائی اور جود و کرم کی وجہ سے حاتم کی طرح مشہور ہو گیا تھا۔ اور مصر، شام، روم، بغداد، عراق، خراسان، ترکستان وغیرہ سے اہل کمال اور شعرا اسکے دربار میں آتے تھے اور کامیاب ہوکر جاتے تھے۔ بارہا ایسا اتفاق ہوا کہ جو کچھ نقد اسباب سامان تھا سب لٹا دیا یہانتک کہ خود اسکے بدن پر پیرہن کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

امیر صاحب کو جیسا کہ خود غرۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھا ہے، سب سے پہلے اسکے دربار میں رسائی حاصل ہوئی اور دو برس تک اسکے دربار میں ملازم رہے، چنانچہ اکثر قصیدے اسکی مدح میں لکھے ہیں، ایک قصیدہ میں مدح کی تمہید لکھتے ہیں،

بود پنہاں آفتاب آں دم کہ صبح ہمی با باد عنبر بو نمود
صبح را گفتم کہ خورشیدت کجاست آسماں روئے ملک چھجو نمود

امیر صاحب نے مثنوی نہ سپہر میں لکھا ہے،

ز شاہاں کسے کاو علم کرد یاد معزالدنیا بو ستہ کیقباد

لیکن اس سے کشلو خاں کی اولیت پر حرف نہیں آتا، کشلو خاں امراء میں سے تھا، بادشاہ نہ تھا۔ بادشاہوں میں سے البتہ سب سے پہلے جس نے امیر صاحب کی قدردانی کی وہ معزالدین کیقباد تھا، امیر صاحب اکثر کشلو خاں کے دربار میں

(بقیہ نوٹ ۴) بن اعزالدین، سلطان غیاث الدین بلبن کا برادر زادہ تھا، سلطان نے اسکو ایک تقریب کرکے خان اعظم کو کشلی خاں کا خطاب دیا، بدایونی (صفحہ ۱۶۴) میں ملک چھجو کو برادر زادہ سلطان غیاث الدین لکھا ہے کہ اسکو کشلو خاں خطاب ملا تھا، ان تمام عبارتوں کو ملاؤ تو ثابت ہوگا کہ علاء الدین، کشلو خاں، چھجو ایک ہی شخص ہیں ۱۲۔

تصنیف لکھکر بجاتے اور مجلس گرم کرتے تھے۔

ایک دن اتفاق سے بغرا خاں (سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا) موجود تھا اور شعر و شاعری کے چرچے ہو رہے تھے، شمس الدین دبیر، اور قاضی اثیر جو مشہور شعرا میں سے تھے وہ بھی حاضر تھے، امیر صاحب نے اپنی زمزمہ سنجی سے وہ سماں باندھا کہ بغرا خاں نہایت متاثر ہوا، اور صلہ کے طور پر لگن بھر کر روپے دیے۔ آتابو خاں کو یہ ناگوار ہوا کہ اسکا وابستۂ دولت دوسرے دربار کا احسان اٹھائے چہرہ سے ملال کے آثار ظاہر ہوے، امیر صاحب نے اسکے بعد بار بار مختلف موقعوں پر اسکی تلافی کرنی چاہی لیکن کتلو خاں کے دل سے وہ پھانس نہ نکلی

بغرا خاں سامانہ کا حاکم تھا، امیر صاحب نے ملک چھجو سے مایوس ہو کر سامانہ کا قصد کیا، بغرا خاں نے نہایت قدر و عزت کی اور ندیم[۱] خاص بنایا، اسی زمانہ میں ۶۷۸؁ھ میں لکھنوتی (بنگال) میں طغرل نے بغاوت کی اور شاہی لشکر کو بار بار شکستیں دیں، بالآخر سلطان غیاث الدین بلبن نے خود اس مہم پر جانے کی طیاریاں کیں اور بغرا خاں کو[۲] ساتھ لیا، امیر صاحب بھی اس سفر میں ساتھ[۳] گئے، سلطان غیاث الدین اس بغاوت کو فرو کر کے دلی واپس آیا اور

[۱] یہ تمام حالات خود امیر صاحب نے عزۃ الکمال کے دیباچہ میں لکھے ہیں۔

[۲] تاریخ فرشتہ

[۳] امیر خسرو نے عزۃ الکمال کے دیباچہ میں ان واقعات کو خود لکھا ہے، لیکن اسقدر پیچیدہ لکھا ہے کہ بڑی مشکل سے اور تاریخوں کے باہم مقابلہ کرنے سے اصل حال کا پتہ چلتا ہے، ایک اور دقت سخت تر یہ ہے کہ عزۃ الکمال کا جو نسخہ میرے پیش نظر ہے، وہ سخت غلط اور گویا بالکل مسخ ہے۔ ۱۲

بنگالہ کی حکومت بغرا خاں کو عنایت کی، امیر صاحب کو اب زیادہ امن و اطمینان کا موقع حاصل تھا، دربار کے شعرا شمس الدین دبیر اور قاضی اثیر علی انکے قیام پر مصر تھے، لیکن وہ دلی کو بنگال کے معاوضہ میں نہیں دے سکتے تھے، چنانچہ رخصت لیکر دلی میں آئے، اتفاق سے اسی زمانہ میں سلطان غیاث الدین کا بڑا بیٹا ملک محمد قاآن (مشہور بہ خان شہید) دلی میں آیا تھا، وہ نہایت قابل صاحب علم، فیاض اور قدردان علم و فن تھا، تہذیب و متانت کا یہ حال تھا کہ جب دربار میں بیٹھتا تو گو کبھی کبھی دن کا دن گزر جاتا تھا، لیکن زانو نہیں بدلتا تھا، اسکی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوان خاقانی، انوری، خمسہ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ ایک بیاض تیار کی تھی، جس میں اپنے مذاق کے موافق بیس ہزار شعر انتخاب کرکے درج کیے تھے، تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ ان اشعار کے حسن انتخاب پر امیر صاحب اور (خواجہ) حسن دہلوی بھی داد دیتے تھے، یہ بیاض ایسی نادر چیز تھی کہ جب شاہزادہ کا انتقال ہوا تو سلطان غیاث الدین نے اپنے خاص دوات دار امیر علی کو دی، امیر علی کے بعد امیر صاحب کے ہاتھ آئی، ارباب ذوق اسکی نقلیں لیتے تھے اور بیاضوں میں درج کرتے تھے[1]۔

امیر صاحب کی شاعری کا شہرہ ہو چکا تھا، سلطان محمد نے انکو بلاکر شعرائے خاص میں داخل کیا، اور جب وہ ملتان کا حاکم مقرر ہوکر گیا تو ان کو اور انکے ساتھ خواجہ حسن دہلوی کو بھی ساتھ لے گیا، پانچ برس تک یہ اسکے دربار میں رہے، اس زمانہ میں ہلاکو خاں کا پوتا ارغوخاں ایران کا حکمران تھا، اسکے امرا میں سے تیمور خاں بیس ہزار سوار لیکر لاہور اور دیبالپور کو فتح اور غارت کرتا ہوا

[1] تاریخ فرشتہ

ملتان کی طرف بڑھا، سلطان محمد قاآن نے ملتان سے لکلکر تمور خاں کو شکست دی، لیکن چونکہ ظہر کی نماز نہیں پڑھی تھی، ایک تالاب کے کنارے پانچ سو آدمیوں کے ساتھ نماز میں مشغول ہوا، موقع پاکر تاتاریوں نے دو ہزار کی جمعیت کے ساتھ حملہ کیا، سلطان محمد نے انہی نمازیوں کے ساتھ نماز سے فارغ ہوکر تاتاریوں کا مقابلہ کیا، اور گو بار بار انکو شکستیں دیں، لیکن اتفاق سے ایک تیر آکر لگا، اور زخم کھا کر مرگیا[1]۔

امیر صاحب اور خواجہ حسن دہلوی بھی اس معرکہ میں شریک تھے، چنانچہ تاتاری انکو گرفتار کرکے بلخ لے گئے، یہ واقعہ ۶۸۳ھ میں پیش آیا[2]، امیر صاحب نے نہایت پُر اثر مرثیے لکھے اور دلّی بھیجے، مہینوں تک لوگ گھر گھر ان مرثیوں کے اشعار پڑھتے تھے اور اپنے مقتول عزیزوں پر نوحہ کرتے تھے۔ چند اشعار ہم ذیل میں درج کرتے ہیں،

واقعہ است ایں یا بلا از آسماں آمد پدید　　آفت است ایں یا قیامت در جہاں آمد پدید

راہ در بنیادِ عالم داد سیل فتنہ زا　　رخنۂ کامسال در ہندوستاں آمد پدید

مجلسِ یاراں پریشاں شد چو برگِ گُل زباد　　برگ ریزی گوئی اندر بوستاں آمد پدید

بسکہ آبِ چشمِ خلقے شد رواں در چار سُو　　پنج آبے دیگر اندر مولتاں آمد پدید

جمع شد سیارہ در چشم گر طوفاں شود　　چوں بہ برجِ آبی انجم را قراں آمد پدید

من نخواہم جز ہماں جمعیت ایں کے شود

خود محال ست ایں نبات النعش پروین کے شود

تا چہ ساعت بُد کہ شاہ از مولتاں لشکر کشید　　تیغ کافر کُش برائے کُشتن کافر کشید

---

[1] تاریخ فرشتہ ۱۲　[2] بدایونی صفحہ ۱۳۱ - ۱۲

انچہ حاضر بود لشکر، لشکرِ دیگر نہ جست | ز انکہ رستم را نشاید بست لشکر کشید
چوں خبر کردندش از دشمن بداں قوت کہ داشت | بے محابا چشم در سرکردہ درایت برکشید
یک کشش از مولتانش تا بہ لاہور اوفتاد | یعنی اندر عہد من کافر تواند سر کشید
آنچناں رنگیں کنم امسال خاک از خون شاں | کز زمیں بایہ شفق را گونۂ احمر کشید
او درین تدبیر و آگہ نے کہ تدبیر فلک | صفحہٴ تدبیر را خطِ مشیت در کشید

تا چہ ساعت بُد کہ کافر بر سر لشکر کشید
میگذشتند جوق جوق از آب ذاگہ در کشید

بہت بڑا مرثیہ ہے اور لڑائی کی تمام کیفیت لکھی ہے، اخیر کے بند جہاں شاہزادہ کی شہادت کا ذکر ہے نہایت پر اثر ہیں،

دو برس کے بعد امیر صاحب نے کسی طرح تاتاریوں کے ہاتھ سے رہائی پائی اور دلّی میں آئے، خان شہید کے مرنے پر جو نوحہ لکھا تھا، غیاث الدین بلبن کے کے دربار میں جاکر پڑھا، دربار میں کہرام پڑ گیا، کسی کو کسی کا ہوش نہ تھا، سلطان اس قدر رویا کہ بخار آگیا اور بالآخر اسی صدمہ میں انتقال کر گیا۔

امیر دلّی سے پٹیالی میں آئے اور گنگا کے کنارے قیام پذیر ہوئے ۶۸۶ھ میں سلطان غیاث الدین بلبن نے وفات پائی اور درباریوں نے اس کے خلاف وصیت، اسکے پوتے کیقباد کو جو بغرا خاں کا بیٹا تھا تخت نشیں کیا،

کیقباد نے امیر صاحب کو دربار میں طلب کیا، لیکن چونکہ عنانِ سلطنت ملک نظام الدین کے ہاتھ میں تھی، اور وہ امیر صاحب سے صاف نہ تھا، امیر صاحب نے تعلق پسند نہ کیا اور خانِ جہاں جو امرائے شاہی میں تھا اسکی

ملازمت اختیار کی،

خان جہاں اودھ کا صوبہ دار مقرر ہوا اور امیر صاحب کو ساتھ لیگیا، چنانچہ خود قران السعدین میں فرماتے ہیں،

خان جہاں حاتم مفلس نواز — گشت باقطاعِ اودھ سرفراز
من کہ بدم چاکرِ او پیش ازاں — کرد کرم انچہ کہ بد بیش ازاں
تا ز چناں بخشش خاطر فریب — بندہ شدہ لازمۂ آن رکیب
در اودم بردہ ز لطف چناں — کیست کہ از لطف تابد عناں
در اودھ از بخششِ او تا دو سال — ہیچ غم و نالہ نبود از منال

دو برس تک اودھ میں رہے، انکی والدہ کو ان سے حد سے زیادہ محبت تھی، وہ دلی میں تھیں، اور انکے خطوط آتے رہتے تھے کہ میں تم سے دور رہکر زندہ نہیں رہ سکتی، امیر صاحب کو بھی ماں سے بے انتہا محبت تھی، چنانچہ سب تعلقات چھوڑ کر دلی میں آئے، ماں نے گلے سے لگایا، اور آنکھوں سے محبت کے دریا بہائے،

مادرم آن خستۂ تیمارِ من — چوں نظر انگندہ بہ دیدارِ من
پردہ ز روے شفقت برگرفت — اشک فشاناں بہ برم درگرفت

کیقباد جب تخت سلطنت پر بیٹھا تو عیاشی اور رندی شروع کی، اسکا باپ بغرا خاں بنگال میں تھا، یہ حالت سنکر بنگال سے روانہ ہوا، کیقباد نے ناخلفی سے باپ کا مقابلہ کرنا چاہا، چنانچہ ایک عظیم الشان فوج تیار کرکے دلی سے روانہ ہوا، راہ میں نامہ و پیغام ہوتے رہے، آخر صلح پر خاتمہ ہوا اور کیقباد دلی کو واپس گیا،

امیر صاحب نے باپ بیٹے کے اتحاد اور مصالحت پر ایک قصیدہ لکھا، جسکے چند شعر یہ ہیں،

زہے ملک خوش چوں دو سلطان یکے شد — زہے عہد خوش چوں دو پایاں یکے شد

پسر بادشاہے، پدر نیز سلطان، — کنوں ملک بیں چوں دو سلطان یکے شد

ز مہر جہانداری و بادشاہی — جہاں را دو شاہِ جہانباں یکے شد

یکے تا سرِ عہد محمود سلطان — کہ فرمانش در چار ارکاں یکے شد

دگر شہ معز جہاں کیقبادے — کہ در ضبطش ایران و توراں یکے

کیقباد چاہتا تھا کہ یہ واقعات، نظم کے پیرایہ میں آئیں، امیر صاحب کو بلاکر یہ خواہش ظاہر کی، چنانچہ امیر صاحب نے چھ مہینے کی مدت میں قران السعدین لکھی، جس میں باپ بیٹے کی مراسلات اور ملاقات کا حال تفصیل سے لکھا ہے، اُسوقت امیر صاحب کی عمر ۳۶ برس کی تھی اور سنہ ہجری ۶۸۸ تھا چنانچہ خود فرماتے ہیں،

ساختہ گشت از دستِ خامہ — از پسِ شش ماہ چنیں نامہ

در رمضاں شد بسعادت تمام — یافت قراں نامہ سعدین نام

انچہ تاریخ ز ہجرت گذشت — بود سنِ ششصد و ہشتاد و ہشت

سالِ من امروز اگر بر رسی — راست گویم ہمہ شش بود و سی

کیقباد عیاشی میں بیمار ہوکر تین برس حکومت کے بعد ۶۸۹ھ میں مرگیا یا مارا گیا، اسکے بعد اسکا خرد سال بیٹا شمس الدین کیکاؤس تخت نشین ہوا، وہ بالکل بچہ تھا، تین مہینے کے بعد امرائے دربار نے تخت سے اُتار کر قید کردیا، اب

خاندان میں کوئی شخص دعویدار سلطنت نہیں رہا تھا اسلیے ترکی امرائے دربار میں سے ملک فیروز شایستہ خاں خلجی جس کی عمر ۷۰ برس کی تھی، اور جس نے دربار میں بڑا اثر حاصل کیا تھا، تخت سلطنت پر بیٹھا، اور سلطان جلال الدین خلجی کے نام سے مشہور ہوا۔ وہ بڑے عظمت و اقتدار و جاہ و جلال کا بادشاہ تھا، اسکے ساتھ نہایت صاحب مذاق، رنگین طبع، خوش صحبت تھا، شعر بھی کہتا تھا، چنانچہ بدایونی نے اسکے دو شعر بھی نقل کیے ہیں،

آں زلف پریشانت ژولیدہ نمی خواہم | وان روے چو گلنارت تفسیدہ نمی خواہم
بے پیرہنت خواہم یک شب بکنار آئی | ہاں بانگِ بلند ست ایں پوشیدہ نمی خواہم

احباب اور شریک صحبت بھی جسقدر تھے، سب قابل، اہل فن، موزون طبع اور رنگین مزاج تھے، مثلاً ملک تاج الدین کرجی، ملک فخر الدین، ملک اعز الدین، ملک قرابیگ، ملک نصرت، ملک حبیب ملک کمال الدین، ابو المعالی، ملک نصیر الدین کمرانی، ملک سعد الدین، انیس اور مصاحب تھے،

اسی طرح اکثر بڑے بڑے اہل کمال ندیمی کے لیے انتخاب کیے تھے، چنانچہ تاج الدین عراقی، خواجہ حسن دہلوی، موید جاجرمی، موید دیوانہ، امیر ارسلان، اختیار الدین باقی، ندمائے خاص میں تھے، ساقی، مغنی، اور مطرب بھی وہ لوگ تھے، مثلاً امیر خاصہ، حمید، راجہ، نظام، محمد شاد، نصیر خاں، بہروز،

ایسے گوناگوں صاحب مذاق بادشاہ کے دربار کے لیے امیر صاحب سے زیادہ کون موزوں ہو سکتا تھا وہ عالم بھی تھے، فاضل بھی، مغنی بھی، مطرب بھی، اور شاعر تو تھے ہی، معز الدین کیقباد کے زمانہ میں جب سلطان

لہ تاریخ فرشتہ ۱۲

جلال الدین عارض تھا، اُسی وقت اُس نے امیر صاحب کو قدردانی کی نگاہ دیکھا تھا، چنانچہ معقول مشاہرہ مقرر کرکے خاص اپنا لباس عنایت کیا تھا تخت پر بیٹھا تو امیر صاحب کو ندیم خاص بنایا اور مصحف[1] داری اور عمارت کا عہدہ دیا، اسکے ساتھ جامہ اور کمربند جو امرائے کبار کا مخصوص لباس تھا انکے لیے مقرر کیا، امیر صاحب امیر کے خطاب سے پکارے جاتے ہیں۔ اسکی وجہ یہی ہے۔

امیر صاحب نے جلال الدین خلجی کے تمام فتوحات نظم کیے، اور تاج الفتوح نام رکھا، اسکی تفصیلی کیفیت آگے آئیگی، جلال الدین خلجی کو اسکے بھتیجے سلطان علاء الدین خلجی نے ۶۹۴ھ میں دھوکے سے قتل کرادیا، اور خود تخت نشین ہوا، سلطان علاء الدین نے اگرچہ دغا اور بے رحمی سے تخت سلطنت حاصل کیا تھا اور اگرچہ سخت دلی اور سفاکی اسکی طینت کا جوہر تھا تاہم بہت بڑے عزم استقلال، شوکت و شان کا فرمانروا گذرا ہے، تعجب انگیز فتوحات اور انتظامی کارناموں کو چھوڑکر علمی فیاضیاں بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں، اسکا دربار فقرا علماء فضلاء شعراء سے ہر وقت معمور رہتا تھا، ان میں بعض کے نام حسب ذیل ہیں،

قاضی فخر الدین ناقلہ، قاضی فخر الدین کرانی، مولانا نصیر الدین، غنی، مولانا تاج الدین مقدم، قاضی ضیاء الدین، مولانا ظہیر الدین لنگ، مولانا ظہیر الدین بھکری، قاضی زین الدین ناقلہ، مولانا شرکتی، مولانا نصیر الدین رازی، مولانا علاء الدین صدر شریف، مولانا میراں باباکلہ، مولانا نجیب الدین بیانوی، مولانا شمس الدین

---

[1] جسکو قرآن مجید رکھنے کی خدمت سپرد ہوتی تھی اسکو مصحف دار کہتے تھے ۱۲

[2] یہ فہرست ضیاء الدین برنی سے ماخوذ ہے ۱۲

مولانا صدرالدین، مولانا علاء الدین لاہوری، قاضی شمس الدین کازرونی، مولانا شمس الدین یحیٰ، مولانا شمس الدین، مولانا صدرالدین بادہ، مولانا معین الدین لولوی، مولانا افتخارالدین رازی، مولانا معیزالدین اندرپتی، مولانا نجم الدین، مولانا حمید الدین بلوری، مولانا علاء الدین کرک، مولانا حسام الدین سادہ، محی الدین کاشانی، مولانا کمال الدین کولوی، مولانا وجیہ الدین کابلی، مولانا منہاج الدین، مولانا نظام الدین کلانی، مولانا نصیرالدین کری، مولانا نصیرالدین پوبی، مولانا علاء الدین تاجر، مولانا کریم الدین جوہری، مولانا محسب ملتانی، مولانا حمیدالدین، مولانا برہان الدین بھکری، مولانا افتخارالدین، مولانا حمیدالدین ملتانی، مولانا گل محمد شیرازی، مولانا حسام الدین سرخہ، مولانا شہاب الدین ملتانی، مولانا فخرالدین نسوی، مولانا فخرالدین تقافلی، مولانا علیم الدین،

قرا، مولانا شاطبی، مولانا علاء الدین سفری، خواجہ زکی،

واعظین، مولانا حسام الدین درویش، مولانا شہاب الدین، مولانا کریم۔

شعراء، خواجہ حسن دہلوی، صدرالدین عالی، فخرالدین قواس، حمیدالدین راجہ، مولانا عارف عبدالحکیم، شہاب الدین، لیکن امیر صاحب کے آفتاب کمال نے ان ستاروں کو بے نور کر دیا تھا،

چنانچہ اس وسیع مرقع میں صرف امیر صاحب کی تصویر نمایاں نظر آتی ہے انکے بعد اگر کسی کے خط و خال پہچانے جاتے ہیں تو وہ خواجہ حسن ہیں، کہ وہ بھی امیر صاحب ہی کا فیض ہے، علاء الدین نے امیر صاحب کا ایک ہزار[1] سالانہ تنکہ مقرر کیا تھا۔ امیر صاحب نے سلطان علاء الدین کی تمام فتوحات کو

[1] تاریخ فرشتہ، غالباً یہ طلائی سکہ ہوگا،

نہایت تفصیل سے لکھا، جسکا نام خزائن الفتوح ہے تفصیل آگے آئیگی۔

۶۹۸ھ میں امیر صاحب کی والدہ اور اُنکے بھائی حسام الدین نے انتقال کیا، چنانچہ لیلیٰ مجنوں میں اس واقعہ کو نہایت پُر درد مرثیہ کی صورت میں لکھا ہے، نظامی کی پنج گنج کا جواب اسی زمانہ میں لکھا، چنانچہ ہر کتاب سلطان علاءالدین کے نام سے معنون ہے، سب سے آخر کی مثنوی ہشت بہشت ہے جو ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی۔

اسی زمانہ میں امیر صاحب نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا (محبوب الٰہی) کے ہات پر بیعت کی، چنانچہ تفصیل آگے آئیگی۔ سلطان علاءالدین نے ۲۱ برس کی حکومت کے بعد ۷۱۶ھ میں وفات پائی، اسکے بعد اسکا بیٹا شہاب الدین (مدت حکومت ۳ ماہ) اور اسکے بعد ۷۱۷ھ میں قطب الدین مبارک بن علاءالدین خلجی، بادشاہ ہوا، وہ اگرچہ نہایت عیاش، بے مغز، اور سبک سر تھا، لیکن امیر صاحب کی قدردانی سب سے بڑھکر کی، چنانچہ امیر صاحب نے جب ۷۱۸ھ میں اسکے نام پر مثنوی نہ سپہر لکھی تو ہاتھی برابر تول کر روپے دیے، خود امیر صاحب قطب الدین کی زبان سے لکھتے ہیں،

بتاریخ ہمچوں من اسکندرے | کند ہر کہ آرایشِ دفترے
ز گنج گراں مایۂ بے شمار | دہم بار بخشش نہ آں پیلبار
مرا خود دریں رہ پدر شد دلیل | کہ سنجید او زر، ہم ترازوئے پیل
نشاسد کسے کش خرد رہنموں | کہ از پیلبار است وزنش فزوں
چو میراث شد پیل زر دادنم | نہ زیبا است زیں سہل تر دادنم

شہا! گنج بخشا! کرم گسترا! | معانی شناسا سخن داورا
چنیں بخششے کز تو ہم یافتم | در ایام پیشینہ کم یافتم
کنوں لابد از سحر سنج چو من | باندازۂ بخشش آمد سخن

قطب الدین خلجی نے ایک ہندو نومسلم غلام کو خسرو خاں کا خطاب دیکر قلمدان وزارت عطا کیا تھا، اسنے ۷۲۱ھ میں قطب الدین کو قتل کرکے خود تخت حکومت پر جلوس کیا، چونکہ اس نے دربار میں تمام ہندو بھر دیئے اور خاندان شاہی پر طرح طرح کے ظلم کیے، امرانے بغاوت کی، چنانچہ چار مہینے کی حکومت کے بعد ۷۲۱ھ میں غازی ملک کے ہاتھ سے قتل ہوا۔

اب خلجی حکومت کا خاتمہ ہوگیا، اور امرائے دربار میں سے غازی ملک نے جس کا باپ سلطان غیاث الدین بلبن کا ترکی غلام اور ماں اُس کی ہندو تھی، دربار میں پکار کر کہا کہ مجکو تخت سلطنت کی آرزو نہیں، خاندان شاہی سے کسی کو تخت نشین کیا جائے۔ لیکن چونکہ خلجی خاندان میں سے کوئی شخص باقی نہیں رہا تھا اور ملک غازی کی خدمات کا تمام دربار معترف تھا، اسلیے سب نے بہ اتفاق اسی کو بادشاہ بنایا۔ وہ سلطان غیاث الدین تغلق کے نام سے مشہور ہوا، اس نے نہایت عدل و انصاف سے حکومت کی اور نئی نئی فتوحات حاصل کیں، تغلق آباد کا مشہور قلعہ اسی کی یادگار ہے، امیر صاحب کی اس نے نہایت قدردانی کی اور انکو مال و دولت سے نہال کردیا، امیر صاحب نے بھی اسکے احسانات کا حق ادا کیا، چنانچہ اسکے نام پر تغلق نامہ لکھا، جو تغلق کے عہد حکومت

کی مفصل تاریخ ہے -

تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا تو امیر صاحب ساتھ گئے، تغلق واپس آیا، لیکن امیر صاحب وہیں رہ گئے، اسی اثناء میں خبر مشہور ہوئی کہ حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء نے انتقال کیا، امیر صاحب یلغار کرتے ہوئے دلی میں آئے اور جو کچھ زر و مال پاس تھا خواجہ صاحب کے نام پر نثار کر دیا، ماتمی سیاہ کپڑے پہن کر خواجہ صاحب کی قبر پر مجاور ہو بیٹھے، چھ مہینے کے بعد ذیقعدہ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا - خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ **خسرو** کو میرے پہلو میں دفن کرنا، لوگوں نے اس وصیت کی تعمیل کرنی چاہی، لیکن ایک خواجہ سرا نے جو وزارت کا منصب رکھتا تھا کہا کہ لوگوں کو دونوں قبروں کی تمیز کرنے میں دھوکا ہوگا، غرض خواجہ صاحب کی پائنتی دفن کیا، اور اس سے زیادہ کیا خوش قسمتی ہو سکتی تھی - انکا مقبرہ مہدی خواجہ نے جو سلطان بابر کے امراء میں سے تھا تعمیر کیا، اور ملا شہاب معمائی نے تاریخ کہکر لوح پر کندہ کرائی -

شد عدیم المثل یک تاریخ او   دان دگر شد طوطی شکر مقال

امیر صاحب کو خدا نے فرزندان معنوی کے علاوہ اولاد ظاہری بھی عنایت کی تھی، انکے ایک صاحبزادہ کا نام ملک احمد ہے، وہ شاعر تھے اور سلطان فیروز شاہ کے دربار میں ندیم تھے، انکی شاعری نے چنداں فروغ نہیں حاصل کیا لیکن شعر اور شاعری کے دقائق سے خوب واقف تھے اشعار کے عیب و ہنر کو خوب پرکھتے تھے، اور نہایت نازک اور دقیق نکتے پیدا کرتے تھے، چنانچہ

---

۱ خزانۂ عامرہ - ۱۲ ۲ فرشتہ - حالات خسرو ۱۲

اکثر اساتذہ کے اشعار پر حرف گیریاں کیں عموماً اہل فن اسکو تسلیم کرتے تھے،
ظہیر کا شعر ہے،

کلاہ گوشہ حکم تو از طریق نفاذ　　ربودہ از سر گردون کلاہ جباری

ملک موصوف نے ربودہ کو فگندہ سے بدل دیا جس سے مصرع کی ترکیب چست
ہو گئی ۔ بخیل کی ہجو میں مشہور شعر ہے،

این سہل بود کہ گو گرد سرخ نو است　　گرنان خواجہ خواستی آں را چہ کردمے

ملک صاحب نے یوں اصلاح دی،

این سہل بود کہ آب حیات خوہست　　گرنان خواجہ خواستی آں را چہ کردمے

نان کے ساتھ آب حیات کے مقابلہ نے لطف پیدا کردیا ایک اور شعر تھا:-

گر مشک خواند خاک درت را فلاک مرنج　　زنخ گہر بطعن خرید ارش اند چہ

ملک موصوف نے پہلے مصرعہ کو یوں بدل دیا،

گر لعل خواند سنگ درت مشتری مرنج،

لیکن انصاف یہ ہے کہ امیر صاحب کی یادگار سے ہم اس سے زیادہ توقع رکھتے تھے۔
بدایونی نے ان اصلاحوں کو نقل کر کے سچ لکھا کہ ملک احمد چونکہ خسرو کی یادگار تھے
اسلیے بادشاہ اور درباری اسکو بھی امیر کا تبرک سمجھتے تھے اور غنیمت جانتے تھے۔

امیر صاحب کی ایک صاحبزادی تھیں لیکن سخت افسوس ہے کہ اُس زمانہ میں
عورتوں کی ایسی بیقدری تھی کہ امیر کو اُنکے پیدا ہونے کا رنج تھا، جب وہ سات
برس کی ہوئیں تو امیر صاحب نے لیلیٰ مجنوں لکھی، اسمیں صاحبزادی سے خطاب کرتے ہیں

اے زعفت فگندہ برقع نور　　ہم غنچہ بنام و ہم مستور

کاش مادر تو ہم بہ چہ بودے | در رحم طفلِ ہشت مہ بودے
لیکن چوں دادۂ خدائے رواست | با خداوندگاں ستیزہ خطاست
من پذیرفتم انچہ یزداں داد | کانچہ او داد باز نتواں داد،
پدرم ہم ز مادر است آخر | مادرم نیز دختر است آخر

پہلے آرزو کی ہے کہ کاش تم پیدا نہ ہوتیں، یا ہوتیں تو بیٹی کے بجاے بیٹا ہوتیں، پھر طرح طرح کی تاویلوں سے دل کو تسلی دی ہے کہ خدا کے دیے کو کون ٹال سکتا ہے، اور آخر میرا باپ بھی تو عورت سے پیدا ہوا، اور میری ماں بھی تو آخر عورت ہی تھی،

صاحبزادی کو جو نصیحتیں کی ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانہ میں عورتوں کی حالت نہایت پست تھی، امیر صاحب اس قدر صاحب دولت و ثروت تھے، لیکن بیٹی سے کہتے تھے کہ خبردار چرخہ کاتنا نہ چھوڑنا، اور کبھی موکھے کے پاس بیٹھکر ادھر اُدھر نہ جھانکنا،

دوک و سوزن گذاشتن نہ فن است | کالتِ پردہ پوشیِ بدن است
پا بدامانِ عافیت سرکُن | رُو بدیوار و پشت بردر کُن
در تماشاے روزنت ہوس است | روزنت چشم سوزنِ تو بس است

امیر صاحب کو اپنی والدہ سے بے انتہا محبت تھی، بڑی عمر کو بھی پہونچکر وہ اُس جوشِ محبت سے ماں سے ملتے تھے جس طرح چھوٹے بچے ماں سے لپٹ جاتے ہیں۔ اودھ کی معقول ملازمت صرف اس بنا پر چھوڑ دی کہ ماں دلی میں تھیں اور اُنکو یاد کیا کرتی تھیں۔ اودھ سے جب دلی میں آئے ہیں تو ماں سے ملنے کا حال اِس جوش سے لکھا ہے کہ لفظ لفظ سے محبت کی شراب ٹپکتی ہے،

ایک موقع پر جب ماں سے ملے ہیں اور ماں نے سینہ سے لگایا ہے تو ایک شعر بے اختیار زبان سے نکلا ہے۔ جسکا مطلب یہ ہے کہ ماں کا سینہ بہشت ہے چنانچہ دو نہریں دودھ کی اس میں جاری ہیں، ۶۹۸ھ میں انھوں نے انتقال کیا۔ اسی سال انکے چھوٹے بھائی حسام الدین نے بھی انتقال کیا، لیلیٰ مجنوں میں دونوں کا مرثیہ ایک ساتھ لکھا ہے؛

امسال دو نور ز اخترم رفت — ہم مادر و ہم برادرم رفت
یک ہفتہ ز بخت خفتۂ من — گم شد دو مہ دو ہفتۂ من
بخت از دو شکنجہ داد پیچم — چرخ از دو طپانچہ کرد ہیچم
ماتم دو شد و غم دو افتاد — فریاد کہ ماتم دو افتاد
حیف است دو داغ چوں منے را — یک شعلہ بس است خرمنے را
یک سینہ دو بار بر نگیرد — یک سر دو خمار بر نگیرد
چوں مادر من بزیر خاک است — گر خاک بسر کنم چہ باک است
اے مادر من کجائی آخر — روے از چہ نمی نمائی آخر
خندان ز دل زمیں بروں آے — بر گریہ زار من ببخشائے
ہر جا کہ ز پاے تو غبار یست — مارا ز بہشت یادگار یست
ذات تو کہ حفظ جان من بود — پشت من و پشتبان من بود
روزے کہ لب تو در سخن بود — پند تو صلاح کار من بود
امروز منم بہ مہر پیوند — خاموشی تو ہمی دہد پند

از تالیس۴۸ برس کی عمر میں ماں کو اس طرح یاد کرتے ہیں جس طرح کمسن بچہ ماں کیلیے بلکتا ہے

اس سے آگے بھائی کے مرثیہ کے شعر ہیں اور وہ بھی خون جگر سے رنگین ہیں۔

امیر صاحب اگرچہ خاندان کے اثر سے شاہی دربار سے تعلق رکھتے تھے، اور اسی قسم کی زندگی بسر کرتے تھے جو عام دنیا داروں کا طریقہ ہے، لیکن یہ امر اُنکی اصل فطرت کے خلاف تھا۔ دربارداری، خوشامد اور نفس پرستی سے انکو طبعی نفرت تھی اور موقع بموقع یہ خیالات بے اختیار اُنکی زبان سے نکل جاتے تھے۔ لیلیٰ مجنوں ۶۹۸ھ میں لکھی تھی، جب انکو سلطان علاء الدین خلجی جیسے جبار بادشاہ سے تعلق تھا، تاہم خاتمہ میں لکھتے ہیں۔

شب تا سحر و ز صبح تا شام ۔۔۔ در گوشۂ غم نگیرم آرام

با تشم ز بہلے نفس خود رسلئے ۔۔۔ پیش چو خودے ستادہ برپلئے

اسپر مزید یہ ہوا کہ اُنکے والد نے انکو آٹھ برس کی عمر میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کے قدموں پر ڈال دیا تھا اور برکت کے لیے بعیت کرا دی تھی، حضرت خواجہ کی روحانی تاثیر چپکے چپکے اپنا کام کرتی جاتی تھی۔ امیر صاحب کی طبیعت میں عشق و محبت کا مادہ بھی ازلی تھا، وہ سر تا پا عشق تھے، اور یہ بجلی اُنکی رگ رگ میں کوندتی پھرتی تھی، آخر یہ نوبت پہونچی کہ ۷۱۲ھ میں جیسا کہ خود افضل الفوائد میں لکھا ہے خواجہ صاحب کے ہات پر دوبارہ بعیت کی، خواجہ صاحب نے چار گوشہ کی ٹوپی جو اس سلسلہ کی نشانی تھی عنایت کی، اور مریدانِ خاص میں داخل کیا، قدرت اللہ قدرت نے طبقات الشعرا میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے جب خواجہ صاحب سے بعیت کی تو جو کچھ نقد اور اسباب تھا سب لٹا دیا اور بالکل دامن ہو کے بیٹھ گئے۔

خواجہ صاحب سے امیر صاحب کی ارادت اور عقیدت، عشق کے درجے تک پہونچ گئی تھی، ہر وقت ساتھ ساتھ رہتے تھے، اور گویا انکا جمال دیکھکر جیتے تھے۔ خواجہ صاحب کو بھی انکے ساتھ یہ تعلق تھا کہ فرمایا کرتے تھے کہ جب قیامت میں سوال ہوگا کہ نظام الدین کیا لایا ہے تو خسرو کو پیش کردونگا۔ دعا مانگتے تھے تو خسرو کی طرف اشارہ کرکے فرماتے تھے، الٰہی! بسوزِ سینۂ ایں ترک مرا بخش،

ایک دفعہ خواجہ صاحب لب دریا ایک کوٹھے پر بیٹھکر ہندوؤں کی عبادت اور اشنان کا تماشا دیکھ رہے تھے، امیر خسرو صاحب بھی حاضر تھے خواجہ صاحب نے فرمایا دیکھتے ہو ؟ ع

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے ،

اُس وقت خواجہ صاحب کی ٹوپی ذرا ٹیڑھی تھی امیر صاحب نے اُسکی طرف اشارہ کرکے برجستہ کہا، ع

ما قبلہ راست کردیم برطرف کجکلاہے ،

جہانگیر نے، تزک جہانگیری میں لکھا ہے[۵] کہ میری مجلس میں قوال یہ شعر گا رہے تھے، میں نے اسکا شان نزول پوچھا، ملا علی احمد مہر کن نے واقعہ بیان کیا، مصرع آخر کے ختم ہوتے ہوتے ملا کی حالت بدلنی شروع ہوئی، یہانتک کہ غش کھاکر گر پڑے دیکھا تو دم نہ تھا۔

خواجہ صاحب نے امیر صاحب کو ترک اللہ کا خطاب دیا تھا، اور اسی

---

[۵] تزک جہانگیری صفحہ ۱۸۔ مطبوعہ علی گڑھ۔

لقب سے پکارتے تھے۔ امیر صاحب نے جا بجا اس پر فخر کیا ہے، چنانچہ ایک قصیدہ میں جو خواجہ صاحب کی مدح میں ہے فرماتے ہیں،

برزبانت چوں خطاب بندہ ترک اللہ رفت   دست ترک اللہ بگیرد ہم باللہش سپار

خواجہ صاحب نے وصیت کی تھی کہ خسرو کو میری قبر کے پہلو میں دفن کرنا، یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر ایک قبر میں دو لاشوں کا دفن کرنا جائز ہوتا تو میں اپنی ہی قبر میں انکو بھی دفن کرتا۔

امیر صاحب نے تصوف میں جو مدارج حاصل کیے اُنکو نہ ہم جان سکتے ہیں اور نہ بیان کرسکتے ہیں۔ یہ البتہ نظر آتا ہے کہ امیر صاحب کا ہر شعر جو بجلیاں گراتا ہے وہ اُسی وادیِ ایمن کی شرر باریاں ہیں،

امیر صاحب کی صوفیانہ زندگی کا ایک بڑا واقعہ حسن دہلوی کے تعلقات ہیں حسن نہایت صاحب جمال تھے اور نان بائی کا پیشہ کرتے تھے۔ امیر صاحب کا عین شباب تھا، کہ ایک دن اتفاق سے انکی دوکان کے سامنے سے گزرے۔ آفتاب حُسن کی شعاعیں امیر پر بھی پڑیں، وہیں ٹھیر گئے اور پوچھا کہ کس حساب سے روٹی بیچتے ہو؟ حسن نے کہا کہ ایک پلڑے پر روٹی رکھتا ہوں اور خریدار سے کہتا ہوں کہ دوسرے میں سونا رکھے۔ سونے کا پلہ جھک جاتا ہے تو روٹی حوالہ کردیتا ہوں، امیر نے کہا اور خریدار مفلس ہو؟ حسن نے کہا تو سونے کے بدلے درد و نیاز لیتا ہوں۔ اس اندازِ گفتگو نے امیر صاحب کو اور بھی بے اختیار کردیا، فوراً حضرت نظام الدین اولیا کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا۔ حسن نے گو ناوک اندازی کی تھی لیکن خود بھی شکار ہوگئے، اُسی وقت دوکان بند کرکے

خواجہ صاحب کی خدمت میں پہنچے، اور اپنے دلدادہ (امیر خسرو) سے ملے اسی تعلق سے خواجہ صاحب کی خدمت میں اکثر آتے جاتے رہتے تھے۔[1]

امیر صاحب سے اسقدر تعلقات بڑھے کہ دونوں ایک دم کے لیے بھی جدا نہیں ہوتے تھے، امیر صاحب نے جب خان شہید کی ملازمت کی تو حسن بھی ساتھ ملازم ہوے، چنانچہ جب ملتان میں خان شہید کو تاتاریوں نے ہلاک کیا تو امیر صاحب کے ساتھ حسن بھی اس موقع پر موجود تھے دونوں کے تعلقات کا چرچا زیادہ پھیلا تو لوگوں نے خان شہید سے شکایت کی، امیر صاحب نے اس واقعہ پر یہ غزل لکھی،

خسروا فرمانِ دل بردن ہمیں بار آورد نزیں دلِ خودکام کارِ من برسوائی کشید

خان شہید نے بدنامی کے خیال سے حسن کو امیر صاحب کے ملنے سے منع کر دیا، لیکن کچھ اثر نہ ہوا۔ خان شہید نے غصہ میں آکر حسن کے ہات پر کوڑے لگوائے۔ حسن سیدھے امیر صاحب کے پاس گئے، خان شہید کو اسی وقت پرچہ لگا۔ نہایت متحیر ہوا۔ اور امیر صاحب کو بلوا بھیجا۔ آئے تو کہا کہ کیا حالت ہے؟ امیر نے آستین سے ہات نکال کر دکھایا اور کہا، ع

گواہِ عاشقِ صادق در آستیں باشد

[1] یہ واقعہ اکثر تاریخوں اور تذکروں میں منقول ہے، لیکن صاحب بہارستان سخن نے اسکی معقول بنا پر تکذیب کی ہے اور شیخ عبد الحق محدث دہلوی کی یہ عبارت نقل کی ہے "بقیاس چناں در می آید کہ حسن را نسبت امیر خسرو گونہ تقدم باشد، چہ امیر حسن را در مدح سلطان غیاث الدین بلبن قصائد است و در کلام امیر خسرو در مدح سلطان کمتر چیزے متوان یافت"۔ ۱۲

دیکھا تو جہاں حسن کے کوڑے لگے تھے وہیں امیر صاحب کے ہات پر بھی کوڑے کے نشان تھے۔

چونکہ حسن کا تذکرہ ہم الگ نہیں لکھتے، اور صنف غزل پر انکا خاص احسان ہے، اسلیے انکے شیدائی، امیر صاحب ہی کے تذکرہ میں انکے اشعار نقل کرتے ہیں

خلق گویند، دل از صبر بجا اور باز — ای دل، از صبر نشانے ده اگر جائے ہست
اگہ نظارۂ دیوانہ نگردی ہرگز — قدمے رنجہ کن این کوے کہ رسوائے است

بر چوں تو، کسے دگر گزیدن — کارے دگرست، کار من نیست
گفتی کہ چرا جدائی از من — این از فلک است، از حسن نیست

باز این دلم بسوئے دلارام میرود — از دام جستہ، باز سوئے دام میرود
ایام در نیامدہ با ما بدوستی — وان شوخ ہم بہ سیرت ایام میرود

اے خواجہ با در محلہ تقوی قیام گیر — در کوے عاشقی نتوان نیکنام شد
عقلم کہ زین بر ابلق ایام می نہاد — آخر بتازیانۂ عشق تو رام شد

طرفہ سرو کہ بے ہست کہ با وعدۂ معشوق — صابر نتوان بود و تقاضا نتوان کرد

از حسن این چہ سوال است کہ معشوق تو کیست — این سخن را چہ جواب است، تو ہم میدانی

دو سہ بار باتو گفتنم کہ مرا ہیچ بستاں :: نہ شد اتفاق، شاید کہ بایں بہا گرانم

تلخ کردم جہانیاں را خواب :: زاں دعا ہا کہ مستجاب نبود

اے حسنِ یار گر خطاے کرد :: ہم شکایت ازو، صواب نبود

بتقوے نامِ نیکو بردہ بودم :: نکورویاں، مرا بدنام کردند

گفتی کہ چرا حالِ دلِ خویش نگوئی :: من خود کنم آغاز، بپایاں کہ رساند؟

ان اشعار سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ جو سوز و گداز، اور جذبہ و اثر، انکے کلام میں موجود ہے انکے کشتۂ محبت (امیر صاحب) میں بھی نہیں،

جامعیت اور کمالات ہندوستان میں چھ سو برس سے آجتک، اس درجہ کا جامعِ کمالات نہیں پیدا ہوا، اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گوناگوں اوصاف کے جامع، ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو ہی چار پیدا کیے ہوں گے۔ صرف ایک شاعری کو لو تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے، فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیم سخن کے جم وکے ہیں، لیکن اُنکی حدودِ حکومت، ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتی، فردوسی مثنوی سے آگے نہیں بڑھ سکتا، سعدی قصیدہ کو ہات نہیں لگا سکتے، انوری مثنوی اور غزل کو چھو نہیں سکتا، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے، لیکن امیر صاحب کی جہانگیری میں غزل،

مثنوی، قصیدہ، رباعی، سب کچھ داخل ہے، اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن
یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع وبدائع کا تو شمار نہیں، تعداد کے لحاظ سے دیکھو تو
اس خصوصیت میں کسی کو انکی ہمسری کا دعویٰ نہیں ہو سکتا۔ فردوسی کے
اشعار کی تعداد کم و بیش ستر ہزار ہے، صائب نے ایک لاکھ شعر سے زیادہ
نہ کہے ہیں، لیکن امیر صاحب کا کلام کئی لاکھ سے کم نہیں۔ اکثر تذکروں میں
خود امیر صاحب کے حوالہ سے لکھا ہے کہ انکا کلام تین لاکھ سے زیادہ اور
چار لاکھ سے کم ہے، لیکن اس میں غالبًا ایک غلط فہمی ہے، امیر صاحب نے
ابیات کا لفظ لکھا ہے اور قدما کے محاورہ میں بیت ایک سطر کو کہتے ہیں، چنانچہ
نثر کی کتابوں کے متعلق یہ تصریحیں جابجا نظر آتی ہیں کہ اس میں اسقدر بیتیں ہیں،

ان سب پر مستزاد یہ کہ اوحدی نے تذکرۂ عرفات میں لکھا ہے کہ امیر صاحب
کا کلام جس قدر فارسی میں ہے اسی قدر برج بھاکا میں ہے۔ کس قدر افسوس
ہے کہ اس مجموعہ کا آج نام ونشان بھی نہیں،

مختلف زبانوں کی زباندانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے
عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں، سنسکرت کے ماہر ہیں، چنانچہ مثنوی
نہ سپہر میں تواضع کے لہجہ میں اسکا ذکر کیا ہے،

من قدرے بر سر آں کار شدم

شاعری کے بعد نثاری کا نمبر ہے۔ اسوقت تک کسی نے نثر لکھنے کے اصول
اور قاعدے نہیں مرتب کیے تھے۔ انھوں نے ایک مستقل کتاب اعجاز خسروی
تین جلدوں میں لکھی، اور اگرچہ افسوس ہے کہ زیادہ تر زور صنائع وبدائع پر بیکار

گیا، لیکن انکی طباعی اور ذہانت سے کون انکار کر سکتا ہے

موسیقی میں یہ کمال پیدا کیا کہ نایک کا خطاب انکے بعد آجتک پھر کوئی شخص حاصل نہ کر سکا، چنانچہ اسکی تفصیل مستقل عنوان میں آتی ہے،

ان مختلف الحیثیات مشغلوں کے ساتھ فقر و تصوف کا یہ رنگ ہے کہ گویا عالم قدس کے سوا دنیاے فانی کو نظر اُٹھا کر نہیں دیکھا۔ چنانچہ اسکا ذکر بھی الگ عنوان میں آئے گا،

ان سب باتوں کے ساتھ جب اسپر نظر کی جاتی ہے کہ ان کاموں میں مشغول ہونے کے لیے وقت کس قدر ملتا تھا، تو سخت حیرت ہوتی ہے، وہ ابتدا سے ملازمت پیشہ تھے اور دربار دل میں تمام دن حاضری دینی پڑتی تھی، کام جو سپرد تھا، وہ شاعری نہ تھی. بلکہ اور اشغال تھے، لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں،

مسکین من مستمند مدہوش | از سوختگی چو دیگ پُر جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
اشتم ز برائے نفس خود راے | پیش چو خودے ستادہ بر پاے

(یعنی نفس پروری کی وجہ سے اپنے ہی جیسے کے آگے صبح سے شام تک مودب کھڑا رہتا ہوں)

تا خوں نہ رود ز پاے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

جب تک پاؤں کا پسینہ سر تک نہیں پہنچتا، کھانا کھانے کو نہیں ملتا،

ان حالات کے ساتھ اگر صانعِ قدرت انکے پیدا کرنے پر ناز کرے، تو چنداں ناموزوں نہ ہوگا،

موسیقی امیر صاحب کی ہمہ گیر طبیعت نے اس نازک اور لطیف فن پر بھی

بھی توجہ کی اور اس درجہ تک پہنچایا کہ چھ سو برس کی وسیع مدت نے بھی ان کا جواب پیدا نہ کیا، انکے زمانہ کا مشہور جگت اُستاد جو تمام ہندوستان کا اُستاد تھا نایک گوپال تھا، اسکے بارہ سو شاگرد تھے جو اسکے سنگھاسن یعنی تخت کو کہاروں کی طرح اُٹھا کر لے چلتے تھے۔ سلطان علاء الدین خلجی نے اسکے کمال کا شہرہ سنا تو دربار میں بلایا، امیر صاحب نے عرض کی کہ میں تخت کے نیچے چھپ کر بیٹھتا ہوں، نایک گوپال سے گانے کی فرمائش کی جائے، نایک نے چھ مختلف جلسوں میں اپنا کمال دکھایا، ساتویں دفعہ امیر صاحب بھی اپنے شاگردوں کو لیکر دربار میں آئے، گوپال بھی انکا شہرہ سُن چکا تھا، ان سے گانے کی فرمائش کی، امیر صاحب نے کہا میں مغل ہوں، ہندوستانی گانا یوں ہی سا جانتا ہوں، پہلے آپ کچھ سنائیں تو میں بھی کچھ عرض کروں گا،

گوپال نے گانا شروع کیا، امیر صاحب نے کہا یہ راگ تو مدت ہوئی میں باندھ چکا ہوں، پھر خود اُسکو ادا کیا۔ گوپال نے دوسرا راگ شروع کیا، امیر صاحب نے اُسکو بھی ادا کر کے بتایا کہ مدتوں پہلے میں اسکو ادا کر چکا ہوں، غرض گوپال جو راگ راگنی اور سُر ادا کرتا تھا، امیر صاحب اُسکو اپنا ایجاد ثابت کر جاتے تھے، بالآخر کہا کہ یہ تو عام بازاری راگ تھے، اب میں اپنے خاص ایجادات سناتا ہوں، پھر جو گانا شروع کیا تو گوپال مبہوت ہو کر رہ گیا[۱]۔

[۱] عالمگیری علما میں فقیر اللہ جسکا لقب سیف خاں تھا، ایک مشہور امیر تھا۔ ناصر علی نے اسی کی شان میں کہا ہے :۔ گفتگوے طوطی از آئینہ می خیزد علی گر نباشد سیف خاں مارا نفس درکار نیست وہ موسیقی کا بڑا ماہر تھا، فن موسیقی کی ایک مستند کتاب مانک سوہل تھی فقیر اللہ نے اُسکا فارسی میں ترجمہ

امیر صاحب چونکہ ہندی کے ساتھ فارسی راگوں سے بھی واقف تھے اسلیے انھوں نے دونوں موسیقی کو ترکیب دیکر ایک نیا علم پیدا کر دیا، چنانچہ اُنکے ایجاد کردہ راگ حسب ذیل ہیں[۱] -

نام راگھاے مخترع امیر خسروؒ	کن راگوں سے مرکب ہے
مجیر،	غار اور ایک فارسی راگ سے مرکّب ہے،
سازگری،	پوربی، گورا، کنگلی اور ایک فارسی راگ، قران السعدین میں اسکا ذکر کیا ہے، چنانچہ کہتے ہیں

۵ زمزمۂ سازگری در عراق ؛ کردہ بہ گلبانگ عراق اتفاق -

ایمن،	ہنڈول اور نیریز،
عُشاق،	سارنگ اور بسنت اور نوا،
موافق،	توڑی و مالری و دوگاہ و حسینی،
غنم،	پوربی میں ذرا تغیر کر دیا ہے،
زیلف،	کھٹ راگ میں شہناز کو ملایا ہے،
فرغنہ،	کنگلی اور گورا میں فرغانہ ملایا ہے،

(بقیہ صفحہ ۲۹) ترجمہ کیا اور بہت سے فوائد اضافہ کیے اور اسکا نام راگ درپن رکھا۔ چنانچہ آثر الامراء جلد دوم صفحہ ۹، ۴ مطبوعہ کلکتہ میں تفصیل مذکور ہے، اس کتاب کا ایک قدیم نسخہ میرے پاس ہے اور ایک ندوہ کے کتبخانہ میں ہے، گوپال کا واقعہ اور آئندہ امیر خسرو کی ایجادات میں نے اسی نسخہ سے لیے ہیں ۱۲

[۱] راگ درپن کے دو نسخے جو میرے استعمال میں ہیں، دونوں غلط ہیں اسلیے راگوں کے نام صحیح نہیں پڑھے گئے، اس لیے کہیں کہیں میں نے صرف صورت نویسی کر دی ہے ۱۲

نام راگ ہائے مخترع امیر خسرو	کن راگوں سے مرکب ہے
سرپردہ ،	سازنگ، بلاول، اور راست کو ترکیب دیا ہے،
باخرز	دیسکار میں ایک فارسی راگ ملا دیا ہے ،
فردوست (یا) پھردوست	کانہڑا، گوری، پوربی اور ایک فارسی راگ سے مرکب ہے ،
منم	کلیان میں ایک فارسی راگ شامل کیا ہے

راگ درپن میں لکھا ہے کہ ان راگوں میں سازگری، باخرز، عشاق اور موافق میں موسیقی کا کمال دکھایا ہے، باقی راگوں میں کچھ یوں ہی ادل بدل کرکے دوسرا نام رکھدیا ہے۔ قول، ترانہ، خیال، نقش، نگار، بسیط، تلانہ سوہلہ، یہ سب بھی امیر صاحب کی ایجاد ہیں، ان میں سے بعض خاص اُنکی ایجاد ہیں، بعض کے نام ہندی میں پہلے موجود تھے، امیر صاحب نے ان میں کچھ تصرف کرکے نام بدل دیا۔

تصانیف جامی نے نفحات الانس میں لکھا ہے کہ امیر صاحب نے ۹۲ کتابیں تصنیف کیں، یہ بھی مشہور ہے کہ امیر صاحب نے خود کسی کتاب میں تصریح کی ہے کہ میرے اشعار پانچ لاکھ سے کم اور چار لاکھ سے زیادہ ہیں۔ امیر صاحب کی کثرت تصنیف سے کس کو انکار ہو سکتا ہے لیکن بیانات مذکورۂ بالا مبالغہ سے خالی نہیں، چار پانچ لاکھ اشعار کی یہ کیفیت ہے کہ قدیم زمانہ میں سطر کو بیت کہتے تھے، اور یہ استعمال نہایت کثرت سے مروج ہے، اس بنا پر اُنکی ہر قسم کی تصانیف کی ۴ - ۵ - لاکھ سطریں

ہوں، تو چنداں تعجب نہیں، لوگوں نے بیت اور شعر کو مرادف سمجھکر بیت کی جگہ شعر لکھدیا۔ ہندی کلام مدوّن نہیں ہوا، اسلیے مبالغہ کے لیے کافی موقع ہے، بہر حال جس قدر تصنیفات آج ملتی ہیں وہ بھی کم نہیں، انکی تفصیل حسب ذیل ہے،

دیوان تحفۃ الصغر[۱] — اسکے دیباچہ میں خود لکھتے ہیں کہ یہ سب سے پہلا دیوان ہے جس میں ۱۶ برس کی عمر سے ۱۹ برس تک کا کلام ہے،

دیوان وسط الحیات — اس میں ۲۰ برس کی عمر سے ۳۲ یا ۳۴ برس تک کا کلام ہے، اس میں جو قصائد ہیں، سلطان شہید کشلو خاں وغیرہ کی مدح میں ہیں۔

عزۃ الکمال — یہ دیوان اپنے بھائی علاء الدین علی خطاط کے کے اصرار سے مرتب کیا، ۳۴ برس کی عمر یعنے ۶۸۵ھ سے تقریباً ۶۹۳ھ تک کا کلام ہے، دیباچہ میں اپنی مختصر سی سوانحعمری لکھی ہے سلطان معز الدین کیقباد اور جلال الدین خلجی کے مدحیہ قصائد

---

[۱] امیر صاحب نے اپنے چاروں دیوانوں کے دیباچوں میں تصنیف کے متعلق کچھ نہ کچھ حالات بھی لکھے ہیں، تحفۃ الصغر اور عزۃ الکمال کا دیباچہ اسوقت میرے پیش نظر ہے اور دیوانوں کے دیباچے بھی نظر سے گزرے ہیں لیکن اسوقت سامنے نہیں، اسلیے انکی نسبت میں جو کچھ لکھتا ہوں وہ ڈاکٹر ریو (آر۔ آئی۔ ری، وی،) کے اُس ریویو سے ماخوذ ہے جو اُنھوں نے برٹش میوزیم کے قلمی نسخوں کی فہرست میں لکھے ہیں، اس اطلاع کے متعلق میں مولوی عبد القادر پروفیسر پونہ کالج کا ممنون ہوں۔

	ہیں، دو ہفتہ میں اسکی ترتیب دی اور دیباچہ لکھا،
بقیہ نقیہ،	بڑھاپے کا کلام ہے۔ تاریخ تالیف مذکور نہیں لیکن سلطان علاءالدین خلجی کا مرثیہ اس میں موجود ہے اسلیے کم از کم ۷۱۵ھ کے بعد تک کا کلام ہے،
نہایۃ الکمال	پانچواں دیوان ہے، اسمیں غزلوں کے علاوہ قطب الدین مبارک خلجی المتوفی ۷۲۰ھ کا مرثیہ اور اسکے ولیعہد کی مرثیں ہیں۔ ایک قصیدہ میں ۷۲۵ھ کا ایک واقعہ مذکور ہے اور اسی سن میں جناب امیر خسرو نے انتقال کیا ہے۔
قران السعدین	سب سے پہلی مثنوی ہے ۶۸۸ھ میں جبکہ مصنف کی عمر ۳۶ برس کی تھی لکھی۔ کیقباد اور بغرا خاں کے مراسلات اور صلح و ملاقات کا کا حال ہے،
مطلع الانوار	مخزن الاسرار کا جواب ہے، سلطان علاءالدین خلجی کے نام پر لکھی؛ ۳۳۱۰ شعر ہیں، دو ہفتہ میں تمام ہوئی، سال اختتام ۶۹۸ھ ہے تصوف کے مضامین ہیں اور پنج گنج کے سلسلہ کی پہلی کتاب ہے۔

شیرین خسرو	رجب ۶۹۸ھ میں تمام ہوئی، ۴۱۲۴ شعر ہیں
آئینۂ اسکندری	سکندرنامہ کا جواب ہے، سال اختتام ۶۹۹ھ ہے۔ اشعار کی تعداد ۴۴۵۰۔
لیلیٰ مجنوں	۲۶۶۰ شعر ہیں، ۶۹۸ھ میں ختم ہوئی۔
ہشت بہشت	سلسلۂ پنج گنج کی سب سے اخیر مثنوی ہے ہفت پیکر نظامی کا جواب ہے، ۷۰۱ھ میں تمام ہوئی ۳۳۸۲ شعر ہیں، پورا خمسہ سلطان علاء الدین خلجی کے نام پر ہے کل ۱۸ ہزار شعر ہیں، خمسۂ نظامی میں ۲۸ ہزار شعر ہیں، پانچوں کتابیں دو برس کی مدت میں تمام ہوئیں۔
تاج الفتوح	سلطان جلال الدین فیروز شاہ کی تخت نشینی کے سال اول یعنی ۶۸۹ھ سے جمادی الآخر ۶۹۰ھ تک کے حالات ہیں، اور اسی سنہ میں یہ مثنوی تمام بھی ہوئی، مطلع یہ ہے سخن بر نام شاہے کردم آغاز
نُہ سپہر	قطب الدین خلجی کے نام پر ہے۔ نو باب ہیں اور ہر باب جداگانہ بحر میں ہے اس مناسبت سے نو سپہر نام رکھا ہے۔ اسوقت امیر خسرو

کی عمر ۶۵ برس کی ہو چکی تھی، سنہ ۷۱۶ھ میں تمام ہوئی۔

دول رانی و خضر خاں

دول رانی۔ گجرات کے راجہ کی لڑکی تھی، خضر خان سلطان علاء الدین کا بیٹا تھا، وہ دیول رانی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس سے شادی کی، خضر خاں نے خود یہ حالات بطور یادداشت کے لکھے تھے، انکی فرمائش سے امیر صاحب نے اسکو نظم کا لباس پنہایا اور عشقیہ نام رکھا، چار مہینے میں تمام ہوئی، ۴۲۰۰ شعر تھے، خضر خاں کے مرنے پر دول رانی کو جو واقعات پیش آئے، انکو لکھا تو ۳۱۹ شعروں کا اضافہ ہوا، سنہ ۷۱۵ھ میں تمام ہوئی۔

افضل الفوائد،

خواجہ نظام الدین اولیا کے ملفوظات ہیں،

اعجاز خسروی

نثر نویسی کے اصول اور قواعد منضبط کیے ہیں اور سینکڑوں صنعتیں اختراع کی ہیں، سنہ ۷۱۹ھ میں تمام ہوئی۔ تین جلدوں میں ہے،

تغلق نامہ

غیاث الدین تغلق کے حالات اور فتوحات ہیں۔

خزائن الفتوح

سلطان علاؤ الدین کے فتوحات ہیں۔

مناقب ہند۔ تاریخ دہلی،

ان کتابوں کا ذکر دولت شاہ نے کیا ہے۔

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ اِن تصنیفات کے علاوہ فن حساب، اور فن موسیقی میں بھی اُنکی تصنیفیں ہیں۔

شاعری امیر صاحب اگرچہ ہندی نژاد تھے، لیکن ایرانی شعرا کو بھی انکی شاعری اور زبان دانی کا اعتراف کرنا پڑا، جامی بہارستان میں لکھتے ہیں کہ خمسہ نظامی کا جواب خسرو سے بہتر کسی نے نہیں لکھا۔ طوطیِ ہند جو اُن کا خطاب تھا، ایرانی بھی اسی خطاب سے اُنکو یاد کرتے ہیں۔

عرفی

بروحِ خسرو ازیں پارسی شکر دادم ٭ کہ کامِ طوطیِ ہندوستاں شود شیریں

خواجہ حافظ

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند ٭ زیں قند پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

آذری نے جواہر الاسرار میں لکھا ہے کہ شیخ سعدی شیرازی خسرو سے ملنے کے لیے شیراز سے دہلی میں آئے۔ اگرچہ یہ روایت قرین قیاس نہیں، اور بعض تذکرہ نویسوں نے صراحۃً اس واقعہ سے انکار کیا ہے۔ تاہم اس سے اسقدر ثابت ہوتا ہے کہ آذری کے نزدیک خسرو اس پایہ کے شخص تھے کہ سعدی کا انکی ملاقات کے لیے سفر کرنا ممکن تھا، اور اس قدر تو تمام تذکرہ نویسوں کو تسلیم ہے کہ جب سلطان شہید نے سعدی کو شیراز سے بلایا تو انھوں نے بڑھاپے کا عذر کیا اور لکھ بھیجا کہ خسرو جوہر قابل ہیں اُنکی تربیت کی جائے، اُسوقت انکی عمر تیس برس سے زائد نہ تھی،

تاہم بعض بعض ایرانی شعرا قومی تعصب کو چھپا نہیں سکے، عبید ایک

شاعر جو امیر کا معاصر ہے کہتا ہے

غلط افتاد خسرو راز نظامی　　　　کہ سکہ بخت در دیگر نظامی

امیر صاحب کی شاعری قدرتی تھی، وہ ماں کے پیٹ سے شاعر پیدا ہوئے تھے، اُنکے باپ دادا، شاعری سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھتے تھے، بلکہ قلم کے بجائے تیغ سے کام لیتے تھے۔ تاہم امیر کے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے تھے کہ اُنکی زبان سے بے اختیار شعر نکلتے تھے، دیباچہ عزۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں،

دراں صغر سن کہ دنداں نمی اُفتاد، سخن می گفتم و گوہر از دہانم می ریخت

دیوان تحفۃ الصغر کے دیباچہ میں لکھتے ہیں،

چوں عمر اُستادے سر آمدہ بر سر نیامدہ بود کہ بر سر دقائق دال شدے وا بوسے، شکسبار قلم را از سواد خطا باز آوردے۔

ایک مدت تک یوں ہی بطور خود کہتے رہے، اُستاد کے بجائے اساتذہ کے دیوان کو سامنے رکھکر انکا تتبع کرتے تھے، جس دیوان کا مطالعہ کرتے تھے اسی انداز پر کہنا شروع کرتے۔ خاقانی کا کلام دیکھا تو بہت مغلق نظر آیا، اُسکے الفاظ حل کیے۔ لیکن خود تحفۃ الصغر میں لکھتے ہیں کہ اُسکا تتبع نہ ہو سکا۔ پہلا دیوان بالکل بے اصلاحی ہے، امیر صاحب اسکو مرتب کرنا بھی نہیں چاہتے تھے، لیکن بھائی کی خاطر سے مجبور ہو گئے۔

لیکن بالآخر وہ اپنا کلام اساتذہ کو دکھلانے لگے مشت بہشت کے خاتمہ میں تصریح کی ہے کہ یہ کتاب شہاب کی اصلاح یافتہ ہے۔ شہاب کی پہلے

نہایت تعریف کی ہے، پھر لکھتے ہیں،

من بہ عرضہ کردہ نامۂ خویش	او با صلاح راند خامۂ خویش
دید ہر نکتہ را رقم بہ رقم	رنج بر خود نہاد و منت ہم
نظرے تیز کرد موے شگاف	نے بہ عمیا نظارۂ گمذاف
ایں دقائق کہ شد زمغز شِ پوست	مو بمو شعر بزکردۂ اوست
شمع من یافتہ ضیا از وے	مسِ من گشتہ کیمیا از وے
ہر چہ او گفت من نہادم گوش	برکشیدم گمس ز شربتِ نوش
وانچہ بنمود و من نہ جستم پے	عیبِ آں برمن است نہ بر وے
یارب او چوں بہ پنج نامۂ من	بُرد بیروں خطاے خامۂ من
نامۂ او کہ عرز جانش باد	در قیامت خطِ اِمانش باد

اخیر کے شعروں سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچوں مثنویاں شہاب کی اصلاح دادہ ہیں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ امیر صاحب نرے مقلد نہ تھے۔ جہاں انکو اصلاح کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی وہاں اُستاد کی رائے تسلیم نہیں کرتے تھے، گو ادب کا پاس اب بھی ملحوظ رکھتے تھے۔

عیب آں برمن است نہ بر وے،

کیا عجیب بات ہے، وہ اُستاد جسکے دامنِ تربیت میں آپ جیسا شخص ملک پرور ہوا ہو آج اُسکا نام ونشان تک معلوم نہیں۔

معاصر اُستادوں کے علاوہ امیر صاحب نے قدیم اساتذہ سے بھی بہت فیض حاصل کیا ہے وہ اُنکے کلام کو سامنے رکھکر کہتے تھے، اور اُسی طرح

اُس سے فائدہ اُٹھاتے تھے جس طرح کوئی شاگرد زندہ اُستاد سے شاعری سیکھتا ہے۔ اسی بنا پر لیلیٰ مجنوں میں نظامی کی نسبت لکھتے ہیں،

زندہ است بمعنی اوستادم ۔۔۔ در نیست بنقش حیات دادم

شیخ سعدی سے استفادہ کا اشارہ کرتے ہیں،

خسرو سرمست اندر ساغر معنی بریخت ۔۔۔ شیرہ از خمخانۂ مستی کہ در شیراز بُو

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ امیر صاحب جوانی کے جوش میں اکثر اساتذہ کی شان میں گستاخی کرتے تھے، چنانچہ جب مطلع الانوار لکھتے ہوئے یہ شعر کہا،

کوکبۂ خسرویم شد بلند ۔۔۔ زلزلہ در گورِ نظامی فگند

تو غیب سے ایک تلوار نکلی اور خسرو کی طرف بڑھی، خسرو نے حضرت خواجہ نظام الدین اولیا کا نام لیا، دفعتًہ ایک ہاتھ نمودار ہوا اور اُسنے آستین تلوار کے سامنے کر دی، تلوار آستین کو کاٹتی ہوئی ایک بیری کے درخت پر جا لگی واللہ اعلم[1]۔

خسرو نے مطلع الانوار ۶۹۸ھ میں لکھی ہے۔ اُسوقت اُنکی عمر ۴۸ برس کی ہو چکی تھی، یہ شباب کا زمانہ کہاں ہے، شباب کے زمانہ میں اُنھوں نے غرۃ الکمال مرتب کیا ہے اُسکے دیباچہ میں صاف لکھتے ہیں کہ میں مثنوی میں **نظامی** کا پیرو اور شاگرد ہوں۔

اسی زمانہ میں قران السعدین لکھی اُس میں لکھتے ہیں۔

نظم نظامی بلطافت چو دُر ۔۔۔ وز دُرِ او سر بسر آفاق پُر

پختہ ازو شد چو معانی تمام ۔۔۔ خام بود پختن سودائے خام

[1] یہ واقعہ جسقدر عقل کے خلاف ہے اُسی قدر تاریخ کے بھی مخالف ہے ۱۲

بگذر ازیں خانہ کہ جائے تو نیست | ویں رہ باریک بپائے تو نیست
کالبدے داری وجاں اندروست | ہرچہ تو دانی بہ ازاں اندروست
تا بود ایں سکہ بنام درست | بر تن تو سکہ بود ایں نقد چیست
مثنوی او در است تماشائے کوے | [illegible] اندر دو دمائے بگوے
ایں ہمہ زانصاف مگر دور نیست | گر تو نہ بینی دگرے کور نیست

نظامی کی نسبت لیلیٰ مجنوں میں لکھتے ہیں۔

زندہ است سخنِ اوستادم | ور نیست منش حیات دادم

غرض امیر صاحب نے کبھی اساتذہ کی اُستادی سے انکار نہیں کیا۔ وہ تمام اُستادوں کا نہایت ادب کرتے تھے۔ مطلع الانوار میں جو کہدیا ہے وہ ایک اتفاقیہ فخریہ جوش تھا جس سے نظامی کی تحقیر منظور نہ تھی۔

امیر صاحب کے حالاتِ شاعری میں یہ سب سے عجیب تر واقعہ ہے کہ وہ اپنے کلام پر آپ ریویو کرتے ہیں، اور ایسی بے لاگ رائے دیتے ہیں کہ انکا دشمن سے دشمن بھی ایسی آزاد رائے نہیں دے سکتا۔ قران السعدین میں اُنھوں نے کیقباد اور بغراخاں کا حال لکھا ہے، لیکن اصلی واقعہ کو چھوڑ کر خاص خاص چیزوں کی تعریف میں اس قدر مصروف ہو جاتے ہیں کہ واقعات کا سلسلہ بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور کلام نہایت بے ربط ہو جاتا ہے۔ اس عیب کو خود ظاہر کرتے ہیں۔

وصف بداں گونہ فرو راندہ ام | کز غرض قصہ فرو ماندہ ام
عیب نہاں نیست کہ بنہفتہ ام | کانچہ بگویند ہمہ گفتہ ام

چوں منم اندر قلبِ کان خویش | معترفت عجز بہ نقصانِ خویش
عیب یکے نیست کہ جویند باز | چوں ہمہ عیب است چگویند باز

غرۃ الکمال کے دیباچے میں لکھتے ہیں کہ شاعری کی تین قسمیں ہیں، اُستاد تمام، جو کسی طرز خاص کا موجد ہو، جیسے حکیم سنائی، انوری، ظہیر، نظامی، اُستاد نیم تمام خود کسی طرز خاص کا موجد نہیں، لیکن کسی خاص طرز کا پیرو ہے اور اُسمیں کمال بہم پہنچایا ہے۔ سارق، جو اوروں کے مضامین چُراتا ہے۔ پھر لکھتے ہیں کہ اُستادی کی چار شرطیں ہیں، طرز خاص کا موجد ہو، اُسکا کلام شعراء کے انداز پر ہو صوفیوں اور واعظوں کے طریقہ پر نہ ہو، غلطیاں اور لغزشیں نہ کرتا ہو۔ یہ شرائط لکھکر فرماتے ہیں کہ میں درحقیقت اُستاد نہیں، اسلیے کہ چار شرطوں میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں، یعنی میں سرقہ نہیں کرتا، اور میرا کلام صوفیوں اور واعظوں کے انداز پر نہیں، لیکن دو شرطیں مجھ میں موجود نہیں اول تو میں کسی طرز خاص کا موجد نہیں۔ دوسرے میرا کلام لغزشوں سے خالی نہیں ہوتا۔ خود اُنکے الفاظ یہ ہیں:-

بندہ را ازاں چہار شرط اُستادی کہ گفتہ شد، اول شرطے کہ ملک طرز است بر نظم ما جرائے کہ در مجرائے قلم جریان یافت کہ چندیں اُستادرا متابع کلمات بودہ ام،

چوں پس روِ طرز ہر سوادم | پس شاگردم نہ اوستادم

و شرطِ دوم آنکہ در نافہٴ سواد بوے خطا نباشد ازیں نیز دم نتوانم زد کہ نظم بندہ اگرچہ بیشتر روان است، اما جابجا در غزل و نفث لغزیدہ

ہم است دریں دو شرط معترفم کہ از لاف اُستادی قریعہ بر قال تو انم غلط نہ۔

کیا دنیا میں اس سے زیادہ کوئی انصاف پرستی اور بے نفسی کی مثال مل سکتی ہے، امیر صاحب کے کلام پر ریویو کرنے کے لیے اس سے زیادہ بڑھکر کیا دلیل راہ ہو سکتا ہے۔

امیر صاحب نے بتا دیا ہے کہ وہ اصنافِ سخن میں سے کس صنف میں کس کے پیرو ہیں، تفصیل اسکی یہ ہے،

غزل، سعدی، مثنوی، نظامی

مواعظ و حکم، سنائی و خاقانی، قصائد، ضیاء الدین نیشاپوری کمال اسمٰعیل خلاق المعانی

لیکن لغزشیں کون بتائے؟ یہ کس کا منہ ہے، ہم دبی زبان سے صرف اسقدر کہہ سکتے ہیں کہ بعض کلام میں (قران السعدین و اعجاز خسروی) لفظی رعایت بہت ہے جو ضلع جگت کی حد تک پہونچ گئی ہے، اور بعض جگہ بالکل تکلف اور آورد ہے۔

امیر صاحب نے شعر و شاعری کے متعلق دیوان کے دیباچہ میں بہت سی نکتے لکھے ہیں جن سے اس فن کے متعلق مفید نتائج حاصل ہو سکتے ہیں۔ غرۃ الکمال کے دیباچہ میں اسپر بحث کی ہے کہ فارسی اور عربی شاعری میں کسکو ترجیح ہے۔ فیصلہ فارسی کے حق میں کیا ہے۔ اور اسکی یہ دلیلیں لکھی ہیں،

(۱) عربی میں ایسے زحافات ہیں کہ اگر فارسی میں ہوں تو کلام ناموزوں ہو جائے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ فارسی کے اوزان ایسے منضبط اور لطیف ہیں کہ ذرا سی کمی بیشی برداشت نہیں کر سکتے،

(۲) عربی زبان میں ایک ایک چیز کے لیے متعدد مرادف الفاظ ہیں اسلیے شاعری آسان ہے، ایک لفظ کسی وزن یا بحر میں نہ کھپ سکا تو دوسرا موجود ہے بخلاف اسکے فارسی میں نہایت محدود الفاظ ہیں. باوجود اسکے فارسی شعرا پر میدان شاعری تنگ نہیں۔

(۳) عربی زبان میں صرف قافیہ ہے ردیف نہیں۔

اب غور کرو عربی زبان کو متعدد طرح کی وسعت حاصل ہے۔ وزن اتنا وسیع کہ جتنے زحافات چاہیں استعمال کرتے جائیں. لفظوں کی یہ بہتات کہ ایک لفظ کے بجائے دوسرا اور دوسرے کے بجائے تیسرا موجود ہے ردیف کی سرے سے ضرورت ہی نہیں. نرے قافیہ پر مدار ہے جسقدر قافیے ملتے جائیں کہتے جاؤ۔ ان سب وسعتوں کے ساتھ. عربی شاعری فارسی شاعری پر غالب نہیں آسکتی۔

اسکے علاوہ عرب کا شاعر اگر ایران میں آئے اور برسوں قیام کرے تاہم فارسی زبان میں شعر نہیں کہہ سکتا۔ لیکن ایران کا شاعر بے تکلف عربی میں شاعری کرسکتا ہے زمخشری اور سیبویہ عجمی تھے لیکن زباندانی میں عرب عربا سے کم نہ تھے۔ فارسی کے وجوہ ترجیح لکھکر لکھتے ہیں کہ اور بہت سے وجوہ ہیں لیکن میں اسلیے قلم انداز کرتا ہوں کہ کوئی مذہبی تعصب کے پردہ میں مخالفت پر نہ آمادہ ہوجائے۔

امیر خسرو فن شاعری میں جن خصوصیات کے لحاظ سے ممتاز ہیں انکی تفصیل حسب ذیل ہے۔

(۱) ایران میں جس قدر شعرا گذرے ہیں. خاص خاص اصناف شاعری

مین کمال رکھتے تھے، مثلاً فردوسی ونظامی مثنوی میں، انوری اورکمال قصائد میں سعدی اورحافظ غزل میں یہی لوگ جب دوسری صنف میں ہات ڈالتے ہیں تو پھیکے پڑجاتے ہیں، بخلاف اسکے امیرصاحب قصائد، مثنوی، اورغزل تینوں میں ایک درجہ رکھتے ہیں، مثنوی میں نظامی کے بعد آجتک انکا جواب نہیں ہوا غزل میں وہ سعدی کے دوش بدوش ہیں، قصائد میں انکی چنداں شہرت نہیں ہوئی، لیکن کلام موجود ہے، مقابلہ کرکے دیکھ لو، کمال اورظہیر سے ایک قدم پیچھے نہیں، تفصیل اسکی آسکے آتی ہے،

(۲) ایشیائی شاعری پریہ عام اعتراض ہے کہ خاص خاص چیزوں پرنظمیں نہیں لکھی گئیں، مثلاً قلم، کاغذ، کشتی، دریا، شمع، صراحی، جام، خاص خاص میووں اورپھولوں وغیرہ وغیرہ پرایسی مسلسل اورلمبی نظمیں نہیں ملتیں، جن سے اُنکی تصویرآنکھوں میں پھرجائے۔ امیرصاحب نے ایشیائی شاعری کی اس کمی کو پوراکردیاہے، اُنھوں نے قران السعدین میں اکثراسی قسم کی نظمیں لکھی ہیں، اوراس کتاب سے اُن کابڑا مقصد اسی قسم کی شاعری کا نمونہ قائم کرناتھا۔ چنانچہ خود فرماتے ہیں:-

بود دراندیشۂ من چند گاہ — کز دل دانندۂ حکمت پناہ
چند صفت گویم و آبش دہم — مجمع اوصاف خطابش دہم
طرز سخن را روشیں نو دہم — سکۂ آں ملک بہ خسرو دہم
سکۂ خود زیں فن اندیشہ زاے — تا نہ نشانم نہ نشینم زپاے
صفت نہ زاں گونہ شد از دل بروں — کاں دگرے را بدل آید کہ چوں

اس قسم کی شاعری کا نام امیر صاحب نے وصف نگاری رکھا، اور یہ نہایت موزوں نام ہے، اگرچہ افسوس ہے کہ زمانہ کے مذاق کے لحاظ سے اس میں نیچر کا پورا رنگ نہیں آیا، بلکہ تکلف اور مضمون آفرینی کا رنگ چڑھا یا ہے، تاہم جس قدر ہے غنیمت ہے۔

کاغذ کی تعریف

کاغذ شامی نسب و صبح دام[1]	آنکہ شد آرایشِ صبحش ز شام
سادہ حریرے ولے اصلش ز خویش	با قصب خز شدہ پیوند خویش
تا بہ حریر آمدہ اندر نورد	طرفہ حریرے کہ تواں جزو کرد
آمدہ اجزائش فراہم ز آب[2]	لیک پراگندگیش ہم ز آب
بسکہ شد از کوبش بسیار پست	پشت دوتا گردیش از نایکست
گہ بود از دستۂ تیغش گذر	گہ دہد از تیغ بہ مقراض سر
گہ خانۂ سوزنِ سطر کشد	گہ کششِ رشتۂ دفتر کشد
حرف بحرف از قلم آرد سخن	لیک بہ پیچد ہمہ بر خویشتن

بہت سے شعر لکھے ہیں، ہم نے قلم انداز کر دیے۔

کشتی کی تعریف

ساختہ از حکمتِ کار آگہاں	خانۂ گردندہ بہ گرد جہاں

---

[1] معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ تک کاغذ شام سے آتا تھا۔

[2] اس سے ثابت ہوتا ہے کہ پہلے بھی اسی طرح کاغذ بناتے تھے کہ روئی اور کپڑے کے چیتھڑوں کو پانی میں بھگو کر پانی کی طرح سیال بنا لیتے تھے، پھر وہ خشک ہو کر کاغذ ہو جاتا تھا۔

نادرۂ حکم قدِ سمٔ سلیم	خانہ رواں، خانگیانش مقیم
اہل سفر را ہمہ بروست گذر	ہمرہِ او ساکن و او در سفر
جاریۂ ہند زبانش سلیم	حاملِ چندیں بچہ، لیکن عقیم
بیشتر از مرغ پرد، در کشاد	بیشتر از باد رود، روز باد
رفتہ دو منزل بہ دمے بل دو چند	بارسن و سلسلہ و تختہ بند
ہمچو کلنگاں بہ ہوا سرفراز	پر چو حواصل زدہ سو کردہ باز
ہر طرفش رہ بہ شتاب دگر	ہر قدمش بر سرِ آب دگر
گرچہ بدریا گذرد بیش و کم	آب نیابد مگرش تا شکم
دست چو در آب فرازد انگند	آب بدست آرد و باز افگند
لطمہ زند بر رخِ دریا بزور	آب ازاں لطمہ بہ فریاد و شور
در رہِ بے آب نداند شدن	کیست کہ بے آب تواند شدن؟

(۳) تشبیہ شاعری کے چہرہ کا غازہ ہے، لیکن تقلید پرستی نے یہ حالت پیدا کر دی تھی کہ جن چیزوں کی جو تشبیہیں ایک دفعہ قدماء کے قلم سے نکل گئیں اُنکے سوا گویا دنیا کی تمام چیزیں بیکار تھیں۔ امیر صاحب نے بہت سی نئی تشبیہیں خود پیدا کیں، چنانچہ غرۃ الکمال میں خود لکھتے ہیں:

تشبیہاتِ نو بسیار است ایں مجمل مجلد را تحمل نتواند کرد، اما دو سہ نظیر باید یاد کردن گزر شدہ،

اسکے بعد دو تین مثالیں لکھی ہیں:

ز انتظارِ دو ماہیِ ساقِ تو صد چشم	بزیر ہر موے دارم چو دامِ ماہی گیر

مژہ ہاے کثر دل آویزت   کثرہاے دوکانِ قصاب ست

زہے خرامش آن نازنین بعیاری   کبوترے بہ نشاط آمدست پنداری

امیر صاحب چونکہ ہندی زبان سے آشنا تھے اسلیے تشبیہات میں اُنکو برج بھاکا کے سرمایہ سے بہت مدد ملی ہوگی۔ اخیر شعر غالبًا اسی خرمن کی خوشہ چینی ہے۔ فارسی شعرا معشوق کی رفتار کو کبک کی رفتار سے تشبیہ دیتے تھے، ہندی میں ہنس کی چال عام تشبیہ ہے، لیکن کبوتر مستی کی حالت میں جس طرح چلتا ہے وہ مستانہ خرام کی سب سے اچھی تصویر ہے۔

قصیدہ، مثنوی، غزل میں اُنھوں نے جو جدتیں پیدا کیں اُنکی تفصیل علیحدہ علیحدہ عنوانوں میں آگے آتی ہے۔

مثنوی مثنوی میں جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں، نظامی کے پیرو ہیں، نظامی کے پنج گنج میں تین قسم کی مثنویاں ہیں، رزمیہ، عشقیہ، صوفیانہ، امیر صاحب نے بھی تینوں مضامین کو لیا ہے اور ہر رنگ کو نظامی کے انداز میں لکھا ہے۔

ایک ایک مثنوی پر ریویو کرنا خاص اُنکے سوانح نگار کا کام ہے۔ البتہ نمایاں مثنویوں کا ذکر کرنا ضروری ہے۔

قران السعدین، یہ سب سے پہلی مثنوی ہے جو ۳۶ برس کی عمر میں لکھی اسلیے اسمیں تکلف اور آورد بہت ہے، لیکن باوجود اسکے اکثر جگہ نہایت بلند رواں اور برجستہ ہے۔ مثنوی کا قصہ نہایت بیہودہ تھا، یعنی باپ بیٹوں کی مخالفانہ خط و کتابت اور حملہ کی تیاری۔ بیٹا یعنی کیقباد نہایت گستاخ اور بے تمیز

تھا۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہی صاحب تخت تھا اور اُسی کی فرمایش سے یہ مثنوی لکھی گئی، بیٹا یہ بھی چاہتا تھا کہ اُسکی گستاخیاں، جنکو وہ اپنی دلیری کے کارنامے سمجھتا تھا، مفصل اور آب ورنگ کے ساتھ لکھی جائیں، اور یہ ثابت کیا جائے کہ باپ کے ہوتے، تخت سلطنت کا مستحق بیٹا ہے۔ اس جھوٹی منطق کو امیر صاحب نے جہاں تک ہو سکا، خوب نباہا ہے، چنانچہ بیٹے کی زبان سے کہتے ہیں۔

گر بہ گہر تاج ستانِ توام — عیب مکن گوہرِ کانِ توام
در ہوس تاج ترا در سر است — من گہرم تاج مرا درخور است
چوں سرم از بخت سرافراز گشت — تاجِ تو بر تارکِ من باز گشت
تخت جہاں بہر تو برپاے کرد — لیک بداں تخت مرا جاے کرد
ملک بمیراث نیابد کسے — تا نزند تیغ دو دستی بسے
از تو اگر نام پدر روشن است — خطبۂ حد بیں کہ بنامِ من است
ہر دو جوانیم من و بخت من — با دو جواں پنجہ بہم در مزن
گرچہ بروئیت نکشم در ستیز — زپئے تعظیم تو شمشیر تیز
لیک تو دانی کہ چو کیں آورم — شیر فلک را بزمیں آورم
جز تو کسے گردم ازیں در زدے — سرزنشِ تیغ منش سر زدے
لیک توئی چوں بہ پئے ایں سریر — من نہ ہم گر تو توانی بگیر

باپ نے جو جواب لکھا ہے دیکھو کس طرح، حرف حرف، پدرانہ محبت کے نشہ سے چور ہے

اے ز نسب گشتہ سزائے سریر — وز ہنری ہیچ پدر بے نظیر
گرچہ غبارہ است زکار توام — سرمۂ چشم است غبار توام

تا تو نہ دانی کہ دریں گفتگوے | از پئے ملک است مرا گفتگوے
گرچہ توانم ز توایں پایہ برد | از تو ستانم نکہ خواہم سپرد
شکر کہ شد زندہ در ایام تو | من ز تو و نام من از نام تو
باش بہ کامم کہ بکام توام | زندہ و نازندہ بنام توام
خواہمت از جاں کہ نپاہی مرا | ور تو بخواہی و نخواہی مرا
جز بہ تمنائے تو سودا نیست | بہتر ازیں ہیچ تمنام نیست
گرچہ کہ سلطانِ جہانم بہ ملک | تاج دہ و تخت ستانم بہ ملک
لیک چو دورم ز توائے نیکبخت | نے خوشم از تاج و نہ شادم ز تخت
بختِ من از پایت بر افلاک سو | با تو چو یکدم نہ نشینم چہ سود

ان خاکسارانہ الفاظ نے بیٹے کے دل پر بھی اثر کیا، اب اسکا لہجہ بدل جاتا ہے اور فرزندانہ جوشِ محبت میں کہتا ہے:

من کہ گلے رستہ باغِ توام | پرتوے از نورِ چراغِ توام
گر ہمہ بر ماہ رسد افسرم | ہم بہ تہ پائے تو باشد سرم
زاید و خود کن تو اشارت ببیں | من سرِ خاقاں فگنم بر زمیں
تاج زنم سر ز تو افراختن | عاج ز تو تخت زمن ساختن
ور بہ ملاقات رہی برائے تست | افسر من خدمتی پائے تست
نیست مرا آں محل و آں شکوہ | کز سرِ خود سایہ فشانم بہ کوہ

باپ جب بیٹے سے ملنے آیا ہے تو بیٹا تخت شاہی پر متمکن تھا، باپ کو دیکھکر بے تحاشا تخت سے اترا اور باپ کی طرف بڑھا، باپ نے چھاتی سے لگا لیا، دیر تک

دونوں جوشِ محبت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے تھے، پھر بیٹے نے باپ کو لیجا کر تخت پر بٹھایا،

گرم فرو جست ز تختِ بلند | کرد بہ آغوش تنِ ارجمند
داشت بہ آغوش خودش تا بدیر | سیر نہ شد چوں شود از عمر سیر
با خودش از فرش بہ اورنگ بُرد | تختِ کیاں باز کیاں را سپرد
گاہ ز دیدہ بہ نثارش گرفت | گاہ دوبارہ بہ کنارش گرفت
گاہ نظر بر رخِ زیباش کرد | گاہ دل از مہر شکیباش کرد
پرسش از اندازہ ز غایت گذشت | حدِ نوازش ز عنایت گذشت

قران السعدین کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ نظم اور لطائف نظم کی پابندی کے ساتھ تاریخی حیثیتیں تمام ملحوظ رکھی گئی ہیں، اس طرح کہ کوئی نثر لکھتا تو اس سے بڑھکر ان باتوں کو نہ لکھتا۔

خمسہ خمسہ میں پانچ مثنویاں ہیں یعنی مطلع الانوار، شیریں خسرو، لیلیٰ مجنوں، آئینۂ اسکندری، ہشت بہشت،

جس ترتیب سے ہم نے ان کتابوں کے نام لکھے ہیں، یہی انکی تصنیف کی ترتیب ہے، چنانچہ امیر صاحب نے خود ہشت بہشت میں تصریح کی ہے، ان پانچوں کتابوں کی تصنیف کا زمانہ کُل سوا دو برس ہے، اور یہ قادرالکلامی اور پُرگوئی کا حیرت انگیز اعجاز ہے۔

اگرچہ اس میں شبہہ نہیں کہ نظامی کے جواب میں جس قدر خمسے لکھے گئے اُن بہ نسبتہً امیر صاحب کا خمسہ سب سے بہتر ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے

کہ ان میں بعض نظامی کی تصنیف سے کچھ نسبت نہیں رکھتیں۔ مطلع الانوار میں صاف خامی نظر آتی ہے اور آئینۂ اسکندری بالکل پھیکی اور کمزور ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ خود امیر صاحب کے دل میں بھی بے اطمینانی تھی۔ آئینۂ اسکندری میں لکھتے ہیں۔

وگر باز گیری تو پیوند خویش — مرا خود عزیز است فرزند خویش
سزد گرچہ آواز خر، خندہ را — بدار غنوں گوش خر بندہ را
بدو باد تحسین دادگر — کہ بر من بہ بخشش گمارد نظر
ہنر جوے و در عیب جوئی مکوش — ترا نیز عیبے است بر خود بپوش

نظامی کے پُر زور رزمیہ معرکوں کے مقابلہ میں انکے زورِ طبع کا یہ نمونہ ہے۔

بگردوں شد از نائے زریں خروش — بدریاے لشکر درافتاد جوش
ہزاہز در آمد بہر دو سپاہ — ز دارو در آمد بخورشید و ماہ
علم سر ز عیوق بر تر کشید — سناں چشم سیارہ بر سر کشید
بیاباں ہمہ بیشۂ شیر گشت — جہانے پُر از شیر و شمشیر گشت
غبارِ زمیں کاہ بر ماہ بست — نفس را درون گلو راہ بست
جہاں گشت روے ہوا گرد ناک — کہ سیارہ گم کرد خود را بخاک
سپاہ از زرہ موج زن تا بہ اوج — چو دریا کہ بادش در آرد بموج
بدریاے آہن جہاں گشتہ غرق — ہوا پُر ز تیغ و زمیں پُر ز برق
ز بانگِ ہیونانِ گیتی نورد — شدہ پُر صدا گنبدِ لاجورد
عرق کردن توسناں در شتاب — بدریاے آتش بر انگیخت آب

شرارہ کہ زد لعل ہنگام رد | ستارہ بروں ریخت از ماہِ نو
نفیر زواز چاشنی کماں | شدہ چاشنی بخش جاں ہر زماں
گرہ بر گرہ دشت پیکاں زناں | زرہ بر زرہ پشت روئیں تناں
بزیر سپر تیغ رخشاں زتاب | چناں کز تہ برگ نیلوفر آب

اس کمی کے مختلف اسباب ہیں، مثنوی امیر صاحب کا اصلی مذاق نہیں، سلاطین کی فرمایش سے وہ مثنویاں لکھتے تھے اور گویا بیگار ٹالتے تھے، چنانچہ خمسہ کا خمسہ دو سوا دو برس میں لکھا ہے اور مطلع الانوار تو صرف دو ہفتہ کی کمائی ہے۔

ان کتابوں کی تصنیف کے زمانہ میں دربار کی خدمتوں سے بہت کم فرصت ملتی تھی۔ لیلیٰ مجنوں کے خاتمہ میں لکھتے ہیں کہ نظامی کو شاعری کے سوا کوئی شغل نہ تھا اور کسی قسم کی بے اطمینانی نہ تھی، میرا یہ حال ہے کہ پاؤں کا پسینہ سر پر چڑھتا ہے تب روٹی ملتی ہے۔

مسکین من مستمند بیہوش | از سوختگی چو دیگ در جوش
شب تا سحر و ز صبح تا شام | در گوشۂ غم نگیرم آرام
با شم ز برائے نفس خود رائے | پیشِ چو خوئے ستادہ بر پائے
تا خوں نہ رود ز پائے تا سر | دستم نہ شود ز آب کس تر

اس خمسہ میں ایک کتاب انکے خاص مذاق کی ہے، یعنی لیلیٰ مجنوں اگرچہ اس کتاب میں بھی اُنھوں نے خاکساری سے نظامی کے سامنے اپنے آپ کو ہیچ کہا ہے

میدا د چو نظم نامہ را پیچ | باقی بگذاشت بہر ما ہیچ

لیکن انصاف یہ ہے کہ انکی لیلےٰ مجنوں اور نظامی کی لیلےٰ مجنوں میں اگر کچھ

فرق ہے تو اس قدر نازک ہے کہ خود وہی اُسکو سمجھ سکتے ہیں۔
اس کتاب میں ہر قسم کی شاعری کے موقع پیدا کیے ہیں، اور اُنکا کمال دکھایا ہے، مثلاً ایک موقع پر دھوپ کی شدت اور گرمی کا سماں دکھاتے ہیں۔

آتش زدہ گشتہ کوہ و کاں ہم	تفتیدہ زمین و آسماں ہم
جائے نہ کہ دیدہ را برد خواب	ابرے نہ کہ تشنہ را دہد آب
مرغان چمن خزیدہ در شاخ	در رفتہ چرندگاں بہ سوراخ
ریگ از تف پختہ در گرانی	چوں تابہ روزِ میہمانی
از گرمیِ ریگہاے گرداں	پُر آبلہ پاے رہ نورداں

عشق و محبت کے جذبات کے دکھانے کا اس سے بڑھکر کونسا موقع مل سکتا تھا اس لحاظ سے اس مثنوی کا ہر شعر گویا ایک پُر درد غزل ہے۔ سگ لیلی کا واقعہ عموماً مشہور ہے اور شعرانے اس دلچسپ روایت کو طرح طرح سے رنگا ہے۔ امیر حسن نے اسکو سب سے زیادہ موثر طریقہ سے ادا کیا ہے۔ مجنوں کُتے سے خطاب کرتا ہے

ہستیم من و تو ہر دو شب گرد	لیکن تو بہ نالہ و من از درد
چوں باز گذر کنی دراں کوے	بر خاک درش زمن نہی روے
ہر خس کہ برد گذاشت گامے	از من برسانیش سلامے
ہر جا کہ نہاد پاے روشن	زنہار بہ بوسی از لب من
خواہد چو ترا درون دہلیز	یادش دہی از سگ دگر نیز
زنجیر خودت نہد چو بر دوش	از گردنِ من مکن فراموش

اس پیرایۂ ادا کو دیکھو، کہتے ہیں کہ جب لیلی تجھکو ڈیوڑھی کے اندر بلاے تو

ایک اور سگِ در کو یاد دلا دینا، جب لیلیٰ تیری گردن میں طوق ڈالے تو دیکھنا میری گردن کو بھول نہ جانا۔

عاشق کا پیام سلام سب لکھتے ہیں، لیکن معشوق عاشق کو کیا لکھتا ہے، نہایت نازک مقام ہے۔ دیکھو امیر صاحب اس نازک موقع کو کیونکر نباہتے ہیں، لیلےٰ مجنوں کو لکھتی ہے:—

اے عاشق دور ماندہ چونی	وے شمع ز نور ماندہ چونی
روزت دانم کہ شب نشان است	شبہاے سیاہ بر چہ سان است
از من بکہ سے بری حکایت	با خود ز کہ می کنی شکایت
در گوشِ کہ؟ نالہ می رسانی	در پاے کہ؟ قطرہ می فشانی
باز ابرِ تو در کدام سوی است	سیلابِ تو در کدام جوی است

معشوق اس قدر ضرور جانتا ہے کہ عاشق رونے دھونے اور درد دل کہنے سے باز نہیں رہ سکتا اب اُسکی غیرت یہ سوالات پیدا کرتی ہے کہ کس کے سامنے روتا ہے؟ کس سے دردِ دل بیان کرتا ہے؟ کس کے آگے میرا نام لیتا ہے، یہ باتیں تو رازداری اور معشوق پرستی کے خلاف ہیں، ان سچے جذبات اور خیالات کو کس خوبی سے ادا کیا ہے۔

آئینہ اسکندری پھیکی ہے لیکن اس کتاب میں بھی انکے مذاق کا جو سیدان آیا ہے اُس میں وہ نظامی کے دوش بدوش ہیں، نظامی نے سکندر او بتِ چینی کی بزم آرائی کا قصہ بڑی آب وتاب سے لکھا ہے، خاص اُس موقع پر خوب زورِ طبع دکھایا ہے جہاں وہ دلربا سکندر کی ایک ایک بات پر اپنی ترجیح ثابت کرتی ہے

امیر صاحب نے بھی یہ معرکہ باندھا ہے اور اسی طرح بُتِ چینی کا فخریہ لکھا ہے۔ نظامی کے فخریہ سے ملا کر دیکھو۔ معشوق چینی کہتا ہے اور سکندر کے ایک ایک وصف کے مقابلہ میں اپنی ترجیح ثابت کرتا ہے،

مشعبد کہ داند جہاں سوختن ۔۔۔ ز من بایدش بازی آموختن

ہمہ خون خوبان کُشی می خورم ۔۔۔ و لے نوش بادم کہ خوش می خورم

رخِ ہر صنم ناپدید از من است ۔۔۔ صنم خانہا را کلید از من است

سپہر آفتابِ زمیں خواندم ۔۔۔ و گر ماہ بیند ہمیں خواندم

سکندر کہ گرد آبِ حیواں ہوس ۔۔۔ نظیر منش بود مقصود و بس

گر او ہست کیخسرو جام جوے ۔۔۔ مرا جام گیتی نمائے است روے

گر از مجلسِ او سمن مے دمد ۔۔۔ مرا لالہ و گل ز تن مے دمد

گر او راست بر تخت جائے نشست ۔۔۔ مرا در دل اوست جائے نشست

گر او تاج خواہد ز شاہاں خراج ۔۔۔ من از سروراں سر ستانم نہ تاج

گر اقبال و دولت ورا یاورند ۔۔۔ مرا ہر دو چوں کمتریں چاکرند

گر او دشمناں را بخوں خوردن است ۔۔۔ مرا خون صد دوست برگردن است

گر او را یکے آئینہ برکف نشست ۔۔۔ دو آئینہ دارم من از پشت دست

کمانِ وے ار صد شکار افگند ۔۔۔ کماں ابروے من صد افگند

کمند وے ار صید بند و مدام ۔۔۔ من آنم کہ صیاد گیرم بدام

گر او را کلاہ نشست بر آسماں ۔۔۔ مرا صد کلاہ است بر آستاں

ہشت بہشت یہ سب سے اخیر مثنوی ہے اور امیر صاحب کی بنا کی ہوئی

اس میں پختگی اور پرکاری کی اخیر حد تک پہنچ گئی ہے، خاص جو بات اس میں ہے وہ واقعہ نگاری کا کمال ہے، ساری کتاب میں فرضی حکایتیں لکھی ہیں، لیکن یہ التزام کیا ہے کہ جو واقعہ لکھا بائے اُسکے نہایت چھوٹے چھوٹے جزئیات جن کے ادا کرنے سے زبان قاصر ہوئی جاتی ہے، ادا کیے بائیں،

تمام کتاب کا یہی انداز ہے اور اس خصوصیت کے لحاظ سے فارسی زبان کی کوئی مثنوی اسکا مقابلہ نہیں کر سکتی۔

مثلاً ایک قصہ لکھا ہے کہ حسن ایک سنار تھا، اُسکو بادشاہ نے ایک جُرم کی بنا پر یہ سزا دی کہ ایک اونچی لاٹ پر چڑھوا دیا، حسن کی بیوی لاٹ کے پاس گئی، حسن نے لاٹ پر سے کہا کہ بازار سے ریشم اور قند لا۔ جب وہ لائی تو کہا کہ ریشم کے تار کے سرے پر قند چپکا کر کسی چیونٹی کے منہ میں جو لاٹ پر چڑھ رہی ہو دیدے، اور خود جلد جلد تار کی گولی کھولتی جائے، چیونٹی تار کو لیے ہوے اوپر چڑھتی چلی گئی، حسن کے قریب پہنچی تو حسن نے تار کو لیکر اُس سے رسّی بٹی، اور پھر ایک خاص تدبیر سے اُسی کے سہارے نیچے اُترا، تمام قصہ بہت لمبا ہے ابتدا کے چند شعر ہم نقل کرتے ہیں،

چوں نگہ کرد خواجہ از بالا | کہ زنش در رسید با کالا
داد شں آواز گفت بر سرِ تار | پارۂ قند کن بزودی یار
دہ بمورے کہ می رود بر میل | تا ببالاش می رود تعجیل
رشتہ را زود زود می(الاتں) بازن | کز نشیب آورد بسوے فراز
ہمچناں کرد زن کہ او فرمود | داد رشتہ بمور و مور ربود

راند بالائے میل تار کشاں　　رسنِ فتنہ بہ حصار کشاں

چوں بہ نزدیک خنہ رفت بہ زور　　ریسماں را ربود خواجہ زدود

قصائد قصیدہ میں انکا کوئی خاص انداز نہیں ہے، کمال اسمٰعیل، خاقانی، اور انوری کی تقلید کرتے ہیں، اور جسکے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں اسکا تتبع کرتے ہیں، خاقانی کا مشہور قصیدہ ہے ؛

مجلس دوۃ آتش دادہ، بایں نہ شیرواں از حجر　　ایں کرد نقل از مقرواں جام راجا داشتہ

اسکے جواب میں بہت بڑا قصیدہ لکھا ہے، وہی انداز، وہی ترکیبیں وہی استعارے ہیں، اور چونکہ خاقانی کا مقابلہ ہے، اسلیے ۱۰۷ شعر کہکر دم لیا ہے، اس میں بھی واقعہ نگاری کا خاص انداز قائم ہے. عید کا بیان کیا ہے اور عید کا پورا سماں دکھایا ہے،

ہر سو جواناں نوسلب، ہر سو عروساں در قصب　　طفلاں نہ خفتہ از طرب دیدہ بفردا داشتہ

از شیر و خرما مرد و زن، در شیر خواری تن بتن　　چوں شیر خواراں در دہن پستان خرما داشتہ

خورشید چوں سر بر زدہ، ہر کس بہ بالیے در شدہ　　ایں رو بہ سوئے میکدہ، او رو بہ مصلا داشتہ

فاسق کسے نا خوردہ گہ، در عیدگہ بیہودہ رہ　　سر بر بساطِ سجدہ گہ دل سوئے صہبا داشتہ

دارئے معلولاں است مے، بل جان مخلول است مے　　خورشید منحول است مے، در طاسِ مینا داشتہ

انکے قصائد میں مدحیہ مضامین ہمیشہ بدمزہ اور پھیکے ہوتے ہیں، جسکی وجہ یہ ہے کہ مدح دل سے اُنکو پسند نہیں، صرف معاش کی ضرورت سے یہ ذلت گوارا کرتے ہیں، اس لیے قصیدہ میں اور اور مضامین کو لیتے ہیں اور اُن میں زورِ طبع دکھاتے ہیں، مثلاً بہار کا سماں، برسات کی رُت، صبح و شام کی کیفیت، ایک

قصیدہ میں برسات کے آغاز سے تمہید شروع کی ہے اور صرف مطلع میں سبب لکھدیا ہے

ابر بارید و ہمہ روے زمیں را تر کرد خبر آرید کہ سبزہ چہ قدر سر بر کرد

سپیدہ دم کہ صبا گشت بوستاں فرسود بساطِ خاک ز دیباے پرنیاں فرسود
چو روے نازکِ گل تابِ آفتاب نداشت زمانہ بر سرش از ابر سایہ باں فرمود
زلالہ خواست چمن ساغرے و یک بخشید ز ابر خواست زمیں شربتے و دہ فرمود
ہر انچہ در ورقِ خویش غنچہ شکل داشت بنفشہ گوش نہاد و صبا بیاں فرمود

صبح کا سماں

سپیدہ دم کہ فلک روشنی بہ گیہاں داد نسیمِ غالیہ در دامنِ گلستاں داد
چو چرخ پیر بہ رخ زد سپیدی و سرخی بہ نقش آئینہ داد آفتابِ خنداں داد
درست مغربی آفتاب را کہ فلک نہاد زیرِ زمیں بامداد تاباں داد
ستارہ را ز چہ شد دیدہ خیرہ از خورشید چو شب ز حقہ مینا قمر سر جنباں داد
غلامِ بادِ صبا ام کہ بامداد و پگاہ صلاے عیش بہ عشرت سراے مستاں داد

باغ

نوبہار است و چمن جلوہ چو حورا کردہ ابرہا رنجتنی لولوے لالا کردہ
گردِ طرۂ سنبل کہ صبا باز شدہ دامنِ لالہ پر از عنبرِ سارا کردہ
بر گل و لالہ سیہ مست و دو آہنگ قمری پاے آلودہ بخوں پائچہ بالا کردہ
عاشقاں رفتہ بگلزار و دل سوختہ را بہ تکلف ز گل و لالہ تسلیا کردہ

لے رواں فرمود، فوراً حاضر کرنا۔

نوبہار است سال ما را روزہ فرماید ہمی | گل چیاں تر دامن از مے لب نیالاید ہمی
بر دہان غنچہ گہ گہ می زند بوسہ نسیم | کاں شکر لب جز بہ بوسہ روزہ نگشاید ہمی
باد در کہسار جام لالہ را بر سنگ زد | گل بخندہ گفت، آرے ایں چنیں باید ہمی
نرگس رعنا قدح بر دست و چشم اندر ہوا | گوئیا میخوارہ ماہ عید را پاید ہمی
| (گویا شراب خوار ماہ عید کو ڈھونڈھتا ہے)

برسات

ہوائے خرم است و ہر طرف باراں ہمی بارد | تو گوئی قطرہ کز بالائے گل ریحاں ہمی بارد
نگوں سر شاخہائے سبز گوئی در ہمی چیند | ز بس کابر در افشاں لولوئے غلطاں ہمی بارد

یعنی شاخیں جو جھکی ہوئی ہیں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بادل نے جو زمین پر موتی برسائے ہیں یہ اُنکے رولنے کو جھکی ہیں۔

چکاں قطرہ ز سرہائے انار تر تو پنداری | کہ ہر دانہ کہ بود واست اندرو نہاں ہمی بارد
خوش آں وقتے کہ مطرب در سماع نیکواں سرخوش | خراماں درمیان سبزہ و باراں ہمی بارد

بعض قصائد سرتاپا موعظت و اخلاق میں ہیں، ان میں بحرالابرار جو بڑا اسیرحاصل قصیدہ ہے مشہور ہے، التزام کیا ہے کہ ہر شعر میں دعویٰ اور اُسکے ساتھ دلیل ہو،

کوس شہ خالی و بانگ غلغلش دردسر است | ہر کہ قانع شد بہ خشک و تر شہ بحر و بر است
عاشقی رنج است و مرداں را بعینہ راحت است | سلسلہ بند است شیراں را مگر دن زیور است

یعنی عاشقی میں گو تکلیف ہے، لیکن مردوں کو وہی آرام دہ ہے، جس طرح شیر زنجیر میں بندھا ہوتا ہے اور یہی زنجیر اُسکا زیور ہے،

مرد پنہاں در گلیمے بادشاہ عالم است | تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است

راہرو چوں دریا کو شد مرید شہوت است | بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہر است
نفس خاک تست ہر گہ نور بالا بر تو تافت | سایہ زیر پا شود ہر گہ کہ بر تارک خور است
کار اینجا کن کہ تشویش است در محشر بسے | آب زینجا بر کہ در دریا بسے شور و شر است
ناکس و کس ہر کہ حرص مال دارد دوزخی است | عود و سرگیں ہر چہ در آتش فتد خاکستر است
اے برادر ما در دہر ار خورد خونت مرنج | چوں ترا خون برادر بہ ز شیر مادر است
دہر خاکے را نمونہ میکند کیں مردم است | بحر آبے را غلولہ میکند کیں گوہر است

اہل سخن کے نزدیک قصیدہ میں شاعر کی جدت طبع کا اندازہ مخلص یعنی گریز سے ہوتا ہے۔ اس معیار کے لحاظ سے امیر خسرو اپنے تمام معصروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، انکے مخالص کی چند مثالیں ذیل میں ہیں،

برسات کے ذکر کے بعد

بر آمد ابر در بخشش گرزاں پایہ در غلطد | نگیرد ہیچکس دستش گر شاہ جہاں گیرد

بہار کی تمہید کے بعد

گل از کم عمرشت گو باش دانی | کہ در خور کیست عمر جاوداں را
نہال باغ شاہی رکن حق آنکہ | ز بزم اوست رونق بوستاں را

کشادہ چہرہ کہ اے شدم بر شنے ہیں | در ملک بنمودم کہ آسماں این است

طلوع صبح کا بیان کر کے

صبح را گفتم کہ خورشید کجا است | آسماں روے ملک جستجو نمود

ندارد روے آں نازک گرا ہیچ پیسے — گرد سایۂ رایاتِ شاہ کامگار آمد

طلوعِ آفتاب کے بعد

خورشید جہانگیر بپندار کہ در بزم — شمشیر کشیدہ ملک الشرق بر آمد

قصائد میں امیر صاحب نے جس قدر جدید مضامین، لطیف استعارات، نئی نئی تشبیہیں، گوناگوں اسباب پیدا کیے اُسکا احاطہ نہیں ہو سکتا، ہم اس موقع پر صرف بہاریہ تمہید کے چند شعر اس لحاظ سے نقل کرتے ہیں کہ بہار شعرا کا پامال میدان ہے لیکن امیر صاحب اس میں بھی سب سے الگ ہیں۔

بوستاں شگفتہ روے لالہ خنداں گشت باز — بر رخِ گل طرۂ سنبل پریشاں گشت باز

سبزہ خطے چند بہرِ خواندن بلبل نوشت — بلبل آنگہ از خطِ خوباں غزلخواں گشت باز

خون لالہ گوئیا خواہد چکید از تیغِ کوہ — یا چکید آں خوں کہ کوہ آلودہ داماں گشت باز

غزل

اوپر پڑھ آئے ہو کہ غزل قدما کے زمانہ تک کوئی مستقل چیز نہ تھی، سعدی نے غزل کو غزل بنا دیا۔ امیر خسرو کی غزل گوئی پر تقریظ کرنی ہو تو صرف یہ کہنا کافی ہے کہ وہی خمخانہ سعدی کی شراب ہے جو دوبارہ کھنچکر تیز ہو گئی ہے۔

غزل کی جان کیا ہے؟ درد، سوز و گداز، جذبات، معاملاتِ عشق و نیاز اسکے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ یہ جذبات اور معاملات جس زبان میں ادا کیے جائیں، وہی زبان ہو جسمیں عاشق، معشوق سے راز و نیاز کی باتیں کرتا ہے یعنی سادہ ہو، بے تکلف ہو، نرم ہو، لطیف ہو، نیاز آمیز ہو۔ اسکے لیے یہ بھی ضرور ہے کہ چھوٹی چھوٹی بحریں ہوں، جملوں کی ترکیبوں میں نام کو بھی اُلجھاؤ نہ ہو،

قریب الفہم خیالات ہوں، اس حد تک امیر صاحب شیخ سعدی کے دوش بدوش ہیں۔ لیکن وہ اس سے بھی آگے بڑھتے ہیں، اُنھوں نے غزل کی اصلیت کے علاوہ کمال شاعری کی بہت سی چیزیں اضافہ کیں اور ایجادات اور اختراعات کے چمن کھلا دیے، یہ سب جمال تھا تفصیل ذیل میں ہے۔

بحروں کی موزونی — وہ اکثر شگفتہ اور چھوٹی چھوٹی بحریں اختیار کرتے ہیں جنھیں خواہ مخواہ بات کو صفائی، سادگی، اور اختصار سے ادا کرنا پڑتا ہے، مثلاً

سرے دارم کہ سامان نیست اورا — بہ دل دردے، کہ درمان نیست اورا
فرامش کرد عمرم روز راز انکہ — شبے دارم کہ پایان نیست اورا
بہ راہ انتظارم ہست چشمے — کہ خوابے ہم پریشان نیست اورا

یارِ من دل زدوستاں برداشت — مہر دیرینہ از میاں برداشت
دردِ دل او نہ کرد کارا رچہ — شکّ از نالہ ام فغاں برداشت
وی بہ تندی بلند کرد ابرو — از پئے کشتنم کماں برداشت

آں دوست کہ بودیر گراں شد — واں صبر کہ داشتم نہاں شد
گفتم کہ اسیر گردی اے دل — دیدی کہ بعاقبت ہماں شد
دل بر دگرے نہم ولیکن — عاشق بہ ستم نمی تواں شد

عاشقے را چو نامہ باز کنید — نامِ من بر سرش طراز کنید

گر شما دینِ عاشقاں دارید | بعد ازیں پیشِ بُت نماز کنید
گاہ مُردن شنیدہ ام محمود | گفت رویم سوے ایاز کنید

داد من آں بتِ طراز نداد | پاسخے نیز دلنواز نداد
خواب ما را بہ بست و باز نکرد | دل ما را ببرد و باز نداد
تو چہ دانی نیاز مندی چیست | چوں خدایت بکس نیاز نداد

سوز و گداز سوز و گداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اُٹھ رہا ہے، اس میں بھی معشوق سے اپنا حال کہ رہے ہیں - کبھی اپنی تصویر کھینچتے ہیں کبھی خود اپنے آپ پر انکو رحم آتا ہے،

ماجرائے دوست پُرسیدی کہ چوں بگذشت حال | اے سرت گردم، چہ میپرسی بدشواری گذشت

اکثر ایسا ہوتا ہے کہ عاشق، معشوق سے اپنی سرگذشت جب بیان کرتا ہے تو تھوڑا سا کہکر اُسکو رونا آتا ہے، ٹھیر جاتا ہے، رو لیتا ہے، پھر آگے بڑھتا ہے اسکی تصویر کھینچتے ہیں،

خسرو است و شب فسانہ دیار دہر بار | قدرے گرید ببیں بر سر افسانہ رود

زانوش خسرو بزیر سر نیافت | سرنہادہ بر سرِ زانو بخفت

اے آشنا کہ گریہ کناں بند میدہی | آب از برون مریز کہ آتش بجاں گرفت

کبھی کبھی عاشق کا دل کہتا ہے کہ صبر سے کام لینا چاہیے، پھر دل پر غصہ

آتا ہے اور کہتا ہے کہ کمبخت جو بات نہیں ہو سکتی اُسکے کہنے سے کیا فائدہ۔ اس معاملہ کو یوں باندھتے ہیں،

غصہ ام می کشد اے دل سخن صبر مگوے — وہ چرا گوئی ازاں کار کہ نتوانی کرد

حسد می بردی اے دشمن! بعقل و دانش خسرو — بیا تا بمرادِ خاطر خود بینی اکنونش

رنج و غم کی اس سے بڑھ کر عبرت انگیز تصویر نہیں کھینچی جا سکتی، عاشق (جس کا فضل و کمال اور عقل اور سمجھ عموماً مسلّم ہے۔ عاشق ہو کر تمام فضل و کمال اور عقل کھو چکا ہے، وہ اپنی حالت پر نظر ڈالتا ہے تو خیال آتا ہے کہ دشمنوں کی امید بر آئی، اسکو کس موثر طریقے سے ادا کیا ہے،

جاں ز تن بردی و در جانی ہنوز — دردہا دادی و درمانی ہنوز

گفتی اندر خواب گہ گہ روے خود بنمایمت — ایں سخن بیگانہ را گو، کا شنا را خواب نیست

غمزۂ تو بر دل سلطاں زند — ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

یعنی تیرا غمزہ بادشاہوں کے دل پر حملہ کرتا ہے، اور برا نہ مان تو فقیروں پر بھی، "ورنہ رنجی" سے کس قدر عاشقانہ خضوع ظاہر ہوتا ہے۔

کشتم از تیغِ جفایش خویش را — بر تو آساں کردم و بر خویش ہم

من کجا خسپم کہ از فریادِ من — شب نمی خسپد کسے در کوے تو

صبر طلب می کند از دل عاشق   همچو خراجی کہ بر خراب نویسند

یعنی معشوق، عاشق کے دل سے صبر چاہتے ہیں، یہ ایسی بات ہے کہ بنجر زمین پر محصول لگایا جائے،

اے دیدہ چہ ریزی از برون آب   کیں شعلہ بجان گرفت ما را
اے خواب! برو کہ باز امشب   سودائے فلاں گرفت ما را

اے عشق کار تو بہ چو من تا کسے فتاد   گویا کسے نماند جہانِ خراب را

دل ندارم غم جاناں بچہ تو انم خورد   پیش ازیں گرچہ غمے بود دلے ہم بودہ است
کس چہ داند کہ چہ رفت از غم تو دوش بمن   از شبِ تیرہ، خبر پرس کہ محرم بودہ است

بیا بر دوستاں جاناں تفضل کن   ہر آں تیرے کہ بر دشمن خطا شد

دل باز سوے آں بتِ بدخو چہ میرود   آں خو گرفتہ باز دراں کوچہ میرود
جاں میرود زتن چو گرہ میزند بزلف   مردن مراست از گرہ او چہ میرود

گر ببینی دل ویرانِ مرا   گوئیا ہیچ گہ آباد نبود

کافرے رختِ دلم غارت کرد   شہر اسلام و مرا داد [illegible]

کرشمہ چند کنی بہر آخر ایں جان است　　نمی دہد ز زمین و صبا نمی آرد

اس مضمون پر تین سو برس کے بعد اہلی نے یوں دست درازی کی،

کرشمہ چند کنی بہر آخر ایں جان است　　نمی دہد ز زمیں آسماں نمی دارد

بہ لبم رسیدہ جانم تو بیا کہ زندہ مانم　　پس از انکہ من نمانم بچہ کار خواہی آمد

جدتِ اسلوب غزل کی ترقی کا نور دز، لطفِ ادا، اور جدتِ اسلوب ہے جسکے موجد شیخ سعدی ہیں، لیکن پھر وہ نقش اولیں تھا۔ امیر صاحب کی بوقلموں طبیعت نے جدتِ اسلوب کے سیکڑوں نئے نئے پیرائے پیدا کر دیے، جو گلوں کے خواب و خیال میں بھی نہ آئے تھے۔ مثلاً یہ مضمون کہ معشوق ظلم و ستم کے ساتھ بھی محبوب ہے، یوں ادا کرتے ہیں

جاں ز تن بُردی و در جانی ہنوز　　دردہا دادی و درمانی ہنوز

یا مثلاً معشوق کی گراں قدری کو اس پیرایہ میں ادا کرتے ہیں۔

ہر دو عالم قیمتِ خود گفتۂ　　نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

معشوق کی آنکھ کو سب مخمور اور مے آلود باندھتے تھے، اسی مضمون کو دیکھو امیر صاحب نے کس انداز سے کہا ہے

مے حاجت نیست مستیم را　　در چشمِ تو تا خمار باشد

معشوق کا عاشقوں کے رنج و غم سے بیخبر ہونا، عام مضمون ہے اسکو کس لطف سے ادا کیا ہے۔

گل چہ داند کہ دردِ بلبل چیست　　او ہمیں کار رنگ و بو داند

معشوق معشوقانہ اداؤں کو چھوڑنا چاہتا ہے، اُسکو یوں باز رکھتے ہیں:

ہنوز ایمان و دل بسیار غارت کردنی داری　　مسلمانی میاموز آں دو چشم نامسلماں را

رخصت کے وقت معشوق کو ٹھیراتے ہیں کہ میرے آنسو تھم جائیں تو جانا،

نمی روی و گریہ می آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

لطف اور قہر کی نگاہ کی تاثیر کا فرق،

گفتم چگونہ می کشی و زندہ می کنی　　از یک نگاہ کشت و نگاہِ دگرتہ کرد

سعدی کا شعر ہے:-

دوستاں منع کنندم کہ چرا دل بتو دادم　　باید اول بتو گفتن کہ چنیں خوب چرائی

یہ مضمون اگرچہ نیچرل ہونے کی حیثیت سے اس قدر اعلیٰ درجے کا تھا کہ اسپر ترقی نہیں ہو سکتی تھی۔ لیکن امیر صاحب نے ایک اور جدید اسلوب پیدا کیا،

جراحتِ جگر خستگاں چہ می پرسی　　ز غمزہ پرس کہ ایں شوخی از کجا آموخت

غالب نے اسی خیال کو اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے

نظر لگے نہ کہیں اُنکے دست و بازو کو　　یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں

معشوق کی آمد کی دلفریبی کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں،

بتے و آفتِ تقوی و آخر ایں ہمہ دانی　　کہ در شہرِ مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

اس مضمون کے ادا کرنے کا معمولی پیرایہ یہ تھا کہ معشوق کے آنے سے لوگوں کے زہد و تقوی میں فرق آتا ہے، بجائے اسکے خود معشوق سے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے شہر میں یوں نہیں آیا کرتے. گویا معشوق کا فتنہ انگیز ہونا اس قدر حد سے بڑھ گیا ہے کہ اپنی حالت کا خیال نہیں، بلکہ یہ فکر ہے کہ اسلام کی

حالت خراب نہ ہو جائے۔

معشوق کی زیادتی لطف کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں

جان ز لطف دہ شراب ناز او نا اندازہ بیش ‏ ‏ ز بوئے مست ساقی میدہد پیمانہ را

وحشی یزدی نے اسی خیال سے ایک اور لطیف خیال پیدا کیا

شراب لطف پر در جام میریزی و میترسم ‏ ‏ کہ زود آخر شود پیمانۂ من در خمار افتم

اکثر جگہ، صرف لفظوں کی الٹ پلٹ سے عجیب لطیف بات پیدا کر دیتے ہیں

چشم بد دور از جمال روئے ‏ ‏ کہ ازو چشم دور نتوان کرد

مردمان در پی و بیہوشی من حیرانند ‏ ‏ من در آن کز چہ ترا دید حیران نشود

گفتیم نا خوش پر ای خسروا ‏ ‏ چون گفتم ز آن لب آن یاد خوش است

گفتم کہ ترا ہمیں غلامم ‏ ‏ گفتا بہ است گناہ من این است

دہنت ذرہ کم از ذرہ است ‏ ‏ رخ ز خورشید ذرہ کم نیست

ایہام، یعنی ذو معنی الفاظ سے عجیب عجیب نکتے پیدا کرتے ہیں

زبان شوخ من ترکی و من ترکی نمیدانم ‏ ‏ چہ خوش بودے اگر بودے زبانش در دہان من

پیش ازیں بر خود نہ یقینے بود ‏ ‏ کہ علم ہیچ دلستان نبرد

ق

تو ببردی ہمہ یقین مرا ‏ ‏ بطریقے کہ کس گمان نبرد

دی روسے تو دیدم و مُردم   شرمندہ بماندہ ام ز رویت

دیگر سر آں نیست کہ من زہد فروشم   ساقی قدحے بادہ کہ بر روئے تو نوشم

اکثر جگہ جملۂ معترضہ یا جملۂ شرطیہ سے عجیب عجیب لطیفے پیدا کرتے ہیں۔ اور یہ انکا خاص مذاق ہے

بر وصلت بادا بوسہ زن پایان پائے   دگر چیزے نگوید بر دہاں ہم

غمزۂ تو بہ نعمت سلطاں زند   ورنہ رنجی بر دل درویش ہم

زخمم آید کہ بہ مہ بیں تو نام دگراں   وگر انصاف بود پیش تو بہ توان گفت

کشتنم از تیغ جفا بہتر خویش را   بہ تو آساں کردم و بر خویش ہم

غمے دارم کہ باد از دوستاں دور   بحق دوستی کز دشمناں ہم

واقعہ گوئی و معاملہ بندی   مولوی غلام علی آزاد خزانۂ عامرہ میں لکھتے ہیں

مخفی نماند کہ ہنگامہ آرائے سخن پردازی شیخ سعدی شیرازی کہ مروج طرز غزل است خال خال وقوع گوئی ہم وارد مثل ایں بیت،

دل و جانم بتو مشغول و نظر در چپ و راست   تا ندانند رقیباں کہ تو منظور منی

اما ناسخ نقوش زمانوی امیر خسرو دہلوی کہ معاصر شیخ سعدی است بانی

وقوع گوئی گردید و اساس آں را بلند ساخت "

عشق و ہوسبازی میں جو حالات پیش آتے ہیں، اُنکے ادا کرنے کو وقوع گوئی کہتے ہیں، اہل لکھنؤ نے اسکا نام معاملہ بندی رکھا ہے - بہر حال اس طرز ادا کے موجد جیسا کہ آزاد نے لکھا ہے امیر خسرو ہیں -

شرف قزوینی، ولی دشت بیاضی، اور وحشی یزدی نے اسکو ترقی کی حد تک پہونچا دیا - آزاد نے وقوع گوئی کی مثال میں امیر خسرو کے یہ اشعار پیش کیے ہیں -

خوش آں زماں کہ برویش نظر نهفته کنم — چو سوئے من نگرد او، نظر بگردانم

غلام آں نفسم کار دم چو خانہ او — بخشم گفت کہ از در کشید بیرونش

چو رفتم بر درش بیاید، درباں گفت ایں مسکیں — گرفتار است شاید کیں طرف بسیار می آید

امیر صاحب کے کلام کے زیادہ تفحص سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے ہر قسم کے نازک، لطیف اور شوخی آمیز معاملات ادا کیے ہیں -

چند گویند کہ گہ گہ، دلش سنگدزی — ایں حدیثے است کہ ہر دل را نیز کند

یعنی لوگ کہتے ہیں کہ خسرو! تم کو وہ کبھی کبھی یاد کرتا ہے - لیکن یہ بات تو لوگ تسلی دینے کے لیے بھی کہدیا کرتے ہیں، اسلیے کیونکر اعتبار آئے -

جانا! اگر شبیت دہن بر دہن نہم — خود را جواب سازد کہ گوئیں دہان کیست

معشوق سے کہتے ہیں کہ اگر میں کبھی رات کو تیرے مُنہ پر مُنہ رکھدوں تو اپنے آپکو سوتا بنا لینا، یہ نہ کہنا کہ ارے یہ کس کا منہ ہے -

دل من ست بود قصہ دوست — گہے ز انجام و گہ ز آغاز می گفت

اندک اندک گہ گہے با یار بودن خوش بود — ور بسیر گردم بسیار بودن ہم خوش است

تو شبینہ می نمائی بہ برکہ بودی امشب | کہ ہنوز چشم مستت اثر خمار دارد
مستِ آں ذو قم کہ شب در کوے خوشیم دیدو گفت | کیست ایں؟ گفتند سگے گدائی میکند
جاں باد فدات آں دم کز بعد دو سہ بوسہ | گویم کہ یکے دیگر، گوئی تو کہ: توانم
وعدہ می خواہم و در بند وفا نیز نیم | غرض آنست کہ بارے ۔ تقاضا باشم

روزمرہ اور عام بول چال عموماً شعرا اور اہل فن اپنے کلام کا رتبہ عام بول چال سے برتر سمجھتے ہیں اسکا نتیجہ یہ ہے کہ ایک جداگانہ زبان پیدا ہوگئی ہے جسکا نام علمی زبان ہے۔

سعدی و نظامی وغیرہ کی زبان اگر بولنے کی قلمبند کیجاتی تو بوستان اور سکندر نامہ کی زبان سے صاف الگ نظر آتی۔ بلکہ آج اگر اُس عہد کی بول چال کی کوئی کتاب ہاتھ آجائے تو ہمکو سمجھنے میں دقت ہوگی۔ لیکن یہ شاعری کا بہت بڑا نقص ہے، بے شبہہ شاعری اور عام تصنیف میں ایسے بہت سے مضامین اور خیالات ادا کرنے پڑتے ہیں جو عام زبان میں ادا نہیں ہوسکتے، اسلیے انکے لیے علمی الفاظ وضع کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن یہ ضرور نہیں کہ ضرورت کے علاوہ اور موقعوں پر بھی یہی مصنوعی زبان استعمال کیجائے خصوصاً غزل کی زبان روزمرہ اور عام بول چال ہونی چاہیے، کیونکہ عاشق و معشوق علمی زبان میں باتیں نہیں کرتے۔

قدما میں فرخی اور متوسطین میں سعدی اور امیر خسرو نے خاص اسکا خیال رکھا کہ روزمرہ اور عام بول چال کو زیادہ وسعت دی جائے۔ سعدی اور خسرو کے کلام میں جو روانی، شستگی اور صفائی پائی جاتی ہے اسکا ایک بڑا گر یہی ہے

امیر صاحب کی غزلیں اکثر اُس زبان میں ہوتی ہیں کہ گویا دو آدمی آپس میں بیٹھکر بالکل بے تکلف اور سیدھی سادی باتیں کر رہے ہیں۔ اس میں کہیں کہیں خاص خاص محاورے بھی آجاتے ہیں جو آج ہمکو اسلیے کسی قدر نامانوس معلوم ہوتے ہیں کہ ہمکو اُس زمانہ کے روزمرہ کے محاورات سے واقفیت نہیں۔

دل بسے بردۂ نکو بشناس آں کہ مجروح تو از آن من است

یعنی تم نے بہت سے دل لیے ہیں، خوب غور کرکے دیکھو، جو بہت زخمی ہو وہی میرا دل ہے۔

صبح روئے تو بہ بینیاں کہ برآمد امروز نیست امکاں کہ چو من خستہ تا شام کشد[1]

لب دہان رخت ہر یکے بلائے دل اند یکے دلم چہ کند جانب کدام شود

یعنی تیرا لب، دہن اور چہرہ سب بلا ہیں، میرا دل کیا کرے، کدھر کدھر جائے۔

گفتم اے دل مرو آنجا کہ گرفتار شوی عاقبت رفت وہماں گفتۂ من پیش آمد

خلقے براہ منتظر جاں سپردن اند اے ترک نیم مست عناں را کشیدہ تر
ذرا باگیں گھوڑے کی تو روکے۔

بوسہ گفت و زباں گردانید خود ہمی گوید و سے گرداند

بوسہ دینے کو کہا، اور پلٹ گیا۔ آپ ہی کہتا ہے اور آپ ہی پلٹ جاتا ہے۔

بوے خوشم آید از تو در جیب گل داری، یا ہمیں است بویت

تیرے بدن سے خوشبو آرہی ہے، تیری جیب میں پھول ہے یا یہ تیری بو ہے۔

خشتناک سالیست در یں عہد وفا را اے اشک زاں حوالی کہ تو می آئی باراں چوں است

اے گل دہن تنگ تست صد تنگ شکر چیزے گل با تو نمی ماند در حسن مگر چیزے

---

[1] تا شام کشد یعنی شام تک زندہ رہ جائے۔ [2] یعنی وہی میرا کہا سامنے آیا ۱۲۔

گویم غم وورزدم ہیں گوئی کہ بترخواہم | بسم اللہ اگر خواہی زیں ہردو بترچیزے
چو سبزہ خویش را خط تو خواند جائے آں باشد | کہ گل از خندہ بر خاک او فتد غنچہ شکم گیرد

یعنی سبزہ جب تیرے خط کی برابری کرے تو یہ زیبا ہے کہ پھول ہنستے ہنستے زمین پر لوٹ جائے اور غنچہ کے پیٹ میں بل پڑ جائیں۔

دلم میخواستی بر ہم عفاک اللہ چنان کردی | مرا میخواستی رسوا بحمد اللہ کہ آں ہم شد

اے صبا دی کہ فلانے بچمن مے بیخورد | ہیچ یاد من گم گشتہ زندانی کرد

از کجا آمدی اے باد کہ دیوانہ شدم | بوے گل نیست کہ می آید ایں بوے کسی است

دل من دور نہ رفت ست نکو میدانم | باز جوئید ہمیں جائے کہ در کوے کسی است

مشتبہ می شود م قبلہ ز رویت چہ کنم؟ | کہ ز ابروے تو چشم بر دو محراب افتاد
تیرا چہرہ دیکھکر مجکو قبلہ میں دہوکا سا پڑتا ہے | کیونکہ مجکو تیری ابروے دو محرابیں نظر آتی ہیں
رخ حجلہ را نمود و مرا گفت تو بہیں | زیں ذوق مست و بیخبرم کاں سخن چہ بود
سب کو منہ دکھلایا اور مجھ سے کہا کہ تو نہ دیکھ | میں اس مزہ میں مدہوش ہوں کہ یہ کیا بات کہدی
ساکنان سر کوے تو نباشند بہوش | کاں زمینے است کہ آنجا ہمہ مجنوں خیزد
زجیشمت کاروان صبر من تاراج کافر شد | مسلماناں کسے دیدہ است کاندر شہر رہ افتد
 | مسلمانوں کسی نے شہر میں بھی ڈاکہ پڑتے دیکھا ہے

باز می سوے من آمد بہ شوخی دل زمن بستد　　بدو گفتم چہ خواہی کرد گفتا کار می آید

عام محاورہ "بکار می آید" ہے "کار می آید" امیر صاحب کے سوا اور کسی کے کلام میں نظر سے نہیں گذرا:

حسن تو عالمے بخواہد سوخت　　ہم در آغاز می تواں دانست

رخ کردی بہ بوسۂ جانے　　بندہ بخرید و رائگاں دانست

(تو نے ایک بوسہ کی قیمت جان قرار دی　　میں نے خرید ا اور یہ سمجھا کہ مفت لیا)

از بہر آں کہ لافِ جمالِ تو میزند　　صد بار لالہ بر دہن اشمیں زدہ است

اجاں فدائے خنجرِ تسلیم کردہ ایم　　خواہی بخش، خواہ بکش رائے رائے تست

ساقی بیار مے کہ چناں سوخت از عشق　　کز سوز ایں کباب ہمہ خانہ بوگرفت

راست کردی ز ابرواں محراب　　می نماید نماز خواہی کرد

(ابروؤں سے تو نے محراب درست کی ہے　　معلوم ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے کا ارادہ ہے)

من آں ترکِ طناز را می شناسم　　من آں مایۂ ناز را می شناسم

شبم تا زد شد جاں بہ دشنامِ مستی　　تو بودی من آواز را می شناسم

باد صبا چو از رخِ او زلف در ربود　　ابر سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

تو حالِ من ہم از زبانِ روز دیگر پرسی　　کہ من پیشے تو پیدا نمی توانم کرد

سا نہا شد کہ نیامد خبرِ دور کوہیت　　دل ویراں شدہ را آہم و آواز کنم

من از سر بزدہ گردم اگر تو یک سخن گوئی　　تو سیدانم کوئی نیک من گفتار میگویم

(... میں بات لکھا ہوں)

سلہ پیدا کردن، ظاہر کرنا۔

ذعولے خونہاے دل خویش میکنم — یک بوسہ بر لبم زن و ماالکلام کن

امیر صاحب نے ایسے بھی بہت سے محاورے باندھے ہیں جو اُنکے سوا اور اہلِ زبان کے کلام میں نہیں ملتے۔ مثلاً

ازگرہ او چہ میرود،

آواز کردن، پکارنا،

گفتا رمیگویم، یوں ہی اک بات کہتا ہوں،

ماالکلام کردن، کسی کو ساکت اور بند کرنا،

اس بات نے بدگمانوں کو موقع دیا ہے کہ یہ ہندوستان کی سکونت کا اثر ہے کہ ہندی محاورے اُنکی زبان سے نکل جاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو، لیکن چونکہ ہم کو اپنے تتبع اور استقرا پر اعتماد نہیں، اسلیے ہم اس بدگمانی میں شریک نہیں ہوسکتے۔

تسلسل مضامین — غزل کا یہ بڑا عیب تھا کہ کسی مسلسل خیال کو ادا نہیں کرتے تھے قصائد کا موضوع مدح ہے۔ مثنویاں، قصے یا اخلاق کے لیے مخصوص ہیں، قطعات میں بھی اور اور باتیں ہوتی ہیں۔ عشق اور محبت کے معاملات میں تفصیلی حالات بیان کرنے ہوں، تو کیونکر کریں۔ اسکے لیے صرف مسلسل غزل کام دے سکتی ہے۔ لیکن قدما بلکہ متاخرین میں بھی اسکا رواج بہت کم ہوا۔ امیر صاحب نے البتہ اکثر مسلسل غزلیں لکھی ہیں اور خاص خاص کیفیتوں کا نقشہ اس خوبی سے کھینچا ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔

مثلاً عاشق، قاصد یا اپنے رازدار سے معشوق کا حال پوچھتا ہے کہ کہاں ہے؟ اور کن لوگوں کے ساتھ ہے؟ کیا کرتا ہے؟ میرا بھی کچھ ذکر کرتا ہے کہ نہیں؟

وغیرہ وغیرہ، دیکھو کس اشتیاق، کس حسرت، کس انداز سے یہ باتیں پوچھتے ہیں

اے صبا با زہمن گوی کہ جاناں چون است؟ | آں گل تازہ وآں غنچۂ خنداں چون است؟
با کہ مے میخورد آں ظالم دورے خوردن | آں رخِ پرخوے وآں زلف پریشاں چون است؟
چشم بدخوش کہ ہشیار نباشد ست است | چشم میگونش کہ دیوانہ کند آں چون است؟
روے وزلفِ بتِ عیار کہ آں ہر دو خوش اند | دلِ دیوانۂ من پہلوے ایشاں چون است؟
روز باشد کہ دلم رفت دوراں زلف باند | یارب آں یوسفِ گم گشتہ بزنداں چون است؟

پوچھتے پوچھتے دفعۃً خیال آتا ہے کہ معشوق کے ذکر میں اپنا تذکرہ خلافِ عاشقی ہے اسلیے ان سب باتوں کو چھوڑ کر کس محویت سے کہتا ہے،

ہم بجان و سرِ جاناں کہ کم وبیش مگوے | گو ہمیں یک سخنِ رست کہ جاناں چون است؟

یعنی معشوق کی جان کی قسم اودھر اودھر کی باتیں نہ کہہ، صرف یہ بتا کہ معشوق کس حالت میں ہے؟

معشوق نے روزہ رکھا ہے، اُسپر عاشق کے دل میں جو جو خیالات پیدا ہوسکتے ہیں اُنکو دیکھو کس طرح ادا کیا ہے،

ماہِ من روزہ میانِ شکرستاں دارد | اے خوش آں روزہ کہ جا در لبِ جاناں دارد
لبِ مے آلودہ دہاں پُر شکر و نرگس مست | اے مسلمانان! کس روزہ بدینساں دارد
خضر گر بر لبش آید، نشکند روزۂ خویش | کاں پسر در تہِ لب چشمۂ حیواں دارد
خونِ من میخورد آخر زنش نہاں نیست | من گرفتم کہ خود او روزہ نہاں دارد
جانِ من گر تو قدم رنجہ کنی، بندۂ تو | قدرے آبِ دو چشم و دل بریاں دارد

معشوق سروسامان کے ساتھ سوار آرہا ہے، عاشق پر حیرت طاری ہوتی ہے

کہ کیا آسمان سے پاتر اتر آیا ہے؟ یہ خوشبو کیسی پھیل رہی ہے؟ کیا ہوا پھولوں میں بس کر آرہی ہے؟۔ پھر خیال آتا ہے کہ نہیں، معشوق آرہا ہے، لیکن ان دلفریبیوں کے ہوتے کس کا ایمان سلامت رہے گا، اسلامی آبادی میں یوں نہیں آنا چاہیے۔ ان خیالات کو سلسل ادا کرتے ہیں،

کہ می آید؟ چنیں یارب نگر مہ بر زمیں آمد ‌ ‌ ‌ چہ گرد است اینکہ میخیزد کہ با جاں ہمنشیں آمد

کہ می را نجنیبت داکہ میداں عنبر آگیں شد ‌ ‌ ‌ کدامیں بادی جنبد کہ بوے یاسمیں آمد

بُتے و آفتِ تقوائے و آخر ایں نمیدانی [سواری] ‌ ‌ ‌ کہ در شہرِ مسلماناں نباید ایں چنیں آمد

بہار آئی ہے، عاشق باغ میں جاتا ہے، مجلس آرائی کے سامان ساتھ ہیں، قاصد کو معشوق کے پاس یہ پیغام دیکر بھیجتا ہے کہ باغ میں عجیب بہار ہے، سبزۂ لبِ جو، اور عالم آب کی سیر قابل دید ہے۔ قاصد سے یہ بھی کہدیا ہے کہ ادھر اُدھر کی باتوں میں لانا چاہیے تو ٹالتا جس طرح ہو سکے ساتھ لانا، اور اگر عالم مستی میں ہو تو اُسی طرح مست اُٹھا لانا۔ ان تمام خیالات کو تفصیل کے ساتھ ایک غزل میں ادا کیا ہے،

آمد بہار و شد چمن و لالہ زار خوش ‌ ‌ ‌ وقتے[1] ہست خوش بہار کہ وقت بہار خوش

در باغ با ترانۂ بلبل درین ہوا ‌ ‌ ‌ مستی خوش است و بادہ خوش ست بہار خوش

ما ئیم و مطربے و شرابے و محرمے ‌ ‌ ‌ جائے بزیر سایۂ شاخِ چنار خوش

اے باد کاہلی مکن و سوے دوست رو ‌ ‌ ‌ مارا بکن بہ آمدنِ آن نگار خوش

چیزے دگر مگوے ہمیں گو کہ در چمن ‌ ‌ ‌ سبزہ خوش ست آب خوش و جو بار خوش

---

[1] وقت کسے خوش بودن، دعائیہ جملہ ہے۔ یعنی خدا اُنکو خوش و خرم رکھے۔

گر خوش کند ترا بہ حدیثے کہ باز گرد | پیشش کُن وبیار و مشوز نہار خوش
در بیشِ کہ ست بود بخفتنش دہ ؎ | ہم ہمچنانکش ست بہ نزدِ من آر خوش
من ست خوش حریفی اویم کہ آن حریف | سرخوش خوش ست مست خُش وہوشیار خوش
با او دران زمان کہ منش راہ می دہد | بازی خوش ست بوسہ خوش ست وکنار خوش
سروِ پیادہ خوش بود اندر چمن ولیک | آن سروِ من پیادہ خوش ست وسوار خوش

بہار میں کیا کیا چاہیے؟ اسکو تفصیل سے لکھتے ہیں،

ہنگامِ گل ست بادہ باید | ساقی و حریفِ سادہ باید
گر غنچہ گرہ در ابرو افگند | پیشانیِ گل کشادہ باید
ساقی برخیز ویار بنشاں | کیں شستہ وآں ستادہ باید
وانگاہ حریفِ سادہ دست | در چنگِ من اوفتادہ باید

بہار کا سامان

بوستاں جلوہ در گرفت اینک | گل ز رُخ پردہ در گرفت اینک
آتشِ لالہ بر فروخت زباد | دامنِ کوہ در گرفت اینک
بلبل آمد نشست بر سرِ گل | بے نوا بود زر گرفت اینک
غنچہ در پیش فاختہ ز اصول | سبقے تازہ بر گرفت اینک
ورق غنچہ را کہ تر شدہ بود | در قشش یکدگر گرفت اینک

یعنی غنچہ کے ورق چونکہ تر تھے اسلیے چپک کر رہ گئے۔

آب را اگرچہ چشم ہا پاک ست | بوستاں را بہ بر گرفت اینک

یعنی پانی گو پاک نظر ہے تاہم اُس نے بانٔ کو سینہ سے لپٹا لیا۔

خار چوں تیز کرد پیکاں را　　گل بصد تو سپر گرفت اینک
طوطی آغاز شعر خسرو کرد　　روے گل در شکر گرفت اینک

جدت جیسا کہ ہم اوپر لکھ آئے ہیں، امیر صاحب کا دعوے ہے کہ انھوں نے سیکڑوں نئی تشبیہیں ایجاد کیں، اور یہ دعوی بڑی حد تک درست ہے۔ انکی ایک غزل بھی نہیں مل سکتی جس میں کوئی نہ کوئی جدید تشبیہ نہ ہو۔ چند مثالیں ہم ذیل میں نقل کرتے ہیں،

راز خوں آلود خویش اے دل منہ با من بروں　　کیں ورق خام ست حرف از وے بروں خواہد گذاشت

اے دل اپنا بھید مجھسے نہ کہہ، کیونکہ یہ کاغذ کچا ہے اس میں حرف پھوٹ نکلے گا۔

زلفِ او پہلوے خالِ لبِ او　　گوئی از شہد مگس می راند

نہ رود مہ بر اوج در شب تار　　تا ز زلفِ تو نردبان نبرد

یعنی چاند اندھیری رات میں بلندی پر نہیں چڑھ سکتا، جبتک اسے تیری زلفوں کی سیڑھیاں نہ لگالے،

(چہرہ کو چاند اور زلف کو زینہ سے تشبیہ دی ہے)

مست سحرا چوں کفِ دست برد از لالہ جام　　خوش کف دستے کہ چندیں جام صہبا برگرفت

اس مضمون کو دانش مشہدی نے عجیب لطیف پیرایہ میں بدل دیا ہے،

دیدہ ام شاخِ گلے بر خویش می پیچم کہ کاش　　می توانستم بیک دست اینقدر ساغر گرفت

یعنی پھول سے لدی ہوئی ایک ڈالی کو دیکھ کر مجھے یہ حسرت آئی کہ کاش میں ایک ہاتھ میں اتنے پیالے لے سکتا۔

غلامِ نرگسِ مستم کہ بامداد پگاہ قدح بدست گرفتہ زخواب برخیزد

گلستاں نسیم سحر یافتہ ست صبا غنچہ را خفتہ دریافتہ است

چناں خواب دیدہ ہست نرگس بخواب کہ گو یا کہ جامِ زر یافتہ است

نرگس کے پھول میں جو زرد کٹوری ہوتی ہے اُسکو جامِ زر سے تشبیہ دیتے ہیں، اور یہ تشبیہ عام تھی، لیکن اس اسلوبِ بیان نے کہ نرگس نے خواب میں دیکھا کہ اُسکو جامِ زر ہات آگیا ہے، ایک خاص لطف پیدا کر دیا۔ اور چونکہ نرگس کو مخمور اور خواب آلود باندھتے ہیں اس لیے خواب دیکھنے کی توجیہ واقعیت کا پہلو رکھتی ہے۔

میروی و گریہ مے آید مرا ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

آنسو کی جھڑی کو سب بارش سے تشبیہ دیتے آئے ہیں، لیکن یہ بالکل نیا اسلوب ہے کہ معشوق سے کہتے ہیں کہ تیرے جانے کے وقت مجکو رونا آتا ہے، اتنا ٹھیر جا کہ بارش تھم جائے۔

مزید لطف یہ ہے کہ معشوق کا جانا ہی اس بارش کی علت ہے اسلیے وہ جانا چاہے گا تو بارش ہوگی، اور اسلیے وہ کبھی نہ جا سکے گا۔

مے میانِ شیشۂ ساقی نگر آتشے گویا بہ آب آلودہ اند

ابر آمد و بہ ساغرِ لالہ شراب کرد در گوشہ ہائے باغ بسے فتح باب کرد

فراشِ باغ بار گہ خود بجائے زد وانگہ برآب، خرگہ سیم از حباب کرد

نرگس کہ شب نخفت ز فریادِ بلبلاں   نہاد سر بہ بالشِ گل میں خواب کرد

مضمون آفرینی خیال بندی اور مضمون آفرینی کا موجد کمال اسمٰعیل خیال کیا جاتا ہے لیکن کمال کی جدت تشبیہات کے ساتھ مخصوص ہے، غزل میں اس نے اس رنگ کی مطلق آمیزش نہیں کی ہے۔ غزل میں نئے نئے مضامین اور نئے نئے اسلوب پیدا کرنے امیر صاحب کی ایجاد ہے اور انھیں پر خاتمہ بھی ہو گیا۔ متاخرین کی مضمون آفرینیاں گو حد سے بڑھ گئیں، لیکن اسکا دوسرا انداز ہے، وہ اور سلسلہ کی چیز ہے، چنانچہ آگے چل کر اسکی حقیقت کھلے گی۔

امیر صاحب کی مضمون آفرینیاں مختلف قسم کی ہیں، مثالوں سے اندازہ ہو گا۔

بخانۂ تو ہمہ روز بامداد بود   کہ آفتاب نیارد شدن بلند آنجا
تیرے گھر میں ہمیشہ صبح رہتی ہے   کیونکہ وہاں آفتاب اونچا نہیں ہو سکتا

زلفِ تو سیہ چراست؟ یا نا (نا پا)   بسیار بدر آفتاب گشتہ است (پھرا)

مشتبہ می شودم قبلہ ز رویت چہ کنم   کہ ز ابروے تو چشمم بہ دو محراب افتاد
چشمِ مستِ تو کہ دی بر منِ بیتاب افتاد   تو نیفگندی از آلودگیِ خواب افتاد

زہجراں چنیں تاریک باشد خانۂ چشمم   کہ ہرگز آفتابِ من دریں روزن نمی آید

پیش تو آفتاب نتواں جست   روز روشن چراغ نتواں کرد[1]

[1] چراغ کردن۔ چراغ جلانا ۱۲

می روی و گریہ می آید مرا　　ساعتے بنشیں کہ باراں بگذرد

دلِ من بہ زلف و رویت شد اسیر چوں نگردد　　شبِ مہتاب دزدے کہ بخانہ در آید

زہے عمر دراز عاشقاں کہ　　شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند
یعنی اگر شبِ ہجر کو بھی شامل کر لیا جائے تو عاشقوں کی عمر کس قدر بڑی ہوتی ہے،

زلف ازاں می بُرد آں شوخ کہ شبہائے غم　　گر شود کوتہ ازاں جا ہمہ پیوند کند
یعنی اپنی زلف وہ اسلئے تراشتا ہے کہ میرے غم کی راتیں چھوٹی ہو جائیں تو اُن میں جوڑ لگا کر بڑھا دے۔

راہے است برائے بردنِ دل　　ابروے تو کز میاں کشادست
یعنی تیری دونوں ابروؤں کے درمیان جو فاصلہ ہے، اسلئے ہے کہ دل لیجانے کیلیے راستہ رہے

زلفت سرو پا شکستہ زاں است　　کز سرو قبت او فتادست

یک شب ز رخِ خویش چراغیم کرم کن　　تا قصہ اندوہ تو ہم پیش تو خوانم
(یعنی کسی رات کو اپنے چہرہ کا چراغ عنایت کرو کہ میں اسکی روشنی میں اپنا قصہ تمہارے سامنے پڑھ کر سناؤں)

خانۂ چشم من خراب شدہ است　　کہ بہ بنیادِ تو نم رفتہ است

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی　　مگر کہ زندہ کُنی خلق را و باز کشی

تنگ زہِ لعلِ تو کانِ نمک ہست — گرچہ تنگ: نمکانِ نمک است
آبِ روے تو ملاحت افزود — گرچہ از آب زبان نمک است

خواہی لے جان برو خواہ بمان باش کہ من — مردنی نیستم امروز کہ جاناں اینجاست

آئینہ کرد حسنِ وے از آسمان سوال — برخاست آفتاب بزانو جواب کرد
(یعنی اُسکے حسن نے آسمان سے آئینہ مانگا - آفتاب نے ادب سے زانو ٹیک کر کہا کہ حاضر ہے)
سرابروے تو گردم گرہش باز کشا — کہ کمانت: باندازہ بازوے کسی است

ہرچند کہ زلف تو سیاہی است جہانگیر — زنگو: پریشان نتواں کرد سیہ را

بہ سایہ خفتہ بدم من کہ یار آمد و گفت — چہ خفتہ کہ رسید آفتاب در سایہ
اکثر شاعرانہ اجتماع النقیضین ثابت کرتے ہیں اور وہ طبیعت پر استعجاب کا اثر پیدا کرتا ہے۔

ع - دو یاد ادی و در ماں ہنوز -

ع - یاد باد آنکہ ہمہ عمر نہ کردی یادم -

صنائع امیر صاحب نے اعجاز خسروی میں صنائع و بدائع پر اس قدر ہمت صرف کی کہ ہمکو بڑا ڈر تھا کہ جو جال اُنھوں نے بچھایا اُس میں خود نہ پھنس جائیں۔ لیکن عجیب حُسن اتفاق ہے کہ جن جن لوگوں نے صنائع وبدائع کو فن بنایا اور اسپر مستقل

کتابیں لکھیں، مثلاً فرنی و ابن المعتز وغیرہ، وہ خود اس بدعت سے محفوظ رہے۔

امیر صاحب اوروں کی بہ نسبت کسی قدر آلودہ ہیں، تاہم انکے صنائع بہت سے بے تکلف بھی ہوتے ہیں اور اس حد تک نہیں پہونچتے کہ نکتہ گیری کی زد میں آجائیں صنعت طباق یعنی اضداد انکی خاص مرغوب چیز ہے اور وہ اسکو بڑی خوبی سے نباہتے ہیں۔ ع دردہا دادی و درمانی ہنوز،

زبند دو جہاں آزاد گردم — اگر تو ہمنشین بندہ باشی
تن درویش را کُشتی بغمزہ — کرم کردی الٰہی زندہ باشی

گفتیم ناخوش چرا ای خسروا! — چون کنم ہاں شکل و آں بانخوش است

بندہ را در غم تو نیست خبر — ہمہ یاران بندہ را خبر است

خُرد سالے بُن کند بید او — اے بزرگانِ شہر داد دہید

عربیت اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ امیر صاحب کو عربی علم ادب میں کمال تھا اور اس فن کی نادر کتابیں انکے حافظہ میں مخزون تھیں۔ تاہم انکو اس فن میں دعوے نہیں۔ عزۃ الکمال کے دیباچہ میں عربی کے چند اشعار لکھے ہیں جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ باوجود اعتراف عجز کے انکو اس زبان پر کس قدر قدرت ہے۔ اشعار یہ ہیں:۔

ذاب الفواد و سال من عینی الدم — وجلی اللہ و امع کلما انا اکتم

دل پگھل گیا، اور آنکھوں سے خون بہا — اور آنسوؤں نے وہ سب کھدیا جو میں چھپاتا تھا

واذا ابحت للّائی الوریٰ کربی الجوی   تبکی الاحبۃ والاعادی ترحم

اور جب میں لوگوں کے سامنے فراق کی تکلیف بیان کرتا ہوں تو دوست روتے ہیں اور دشمنوں کو رحم آتا ہے

یا عاذل العشاق دعنی باکیا   ان السکون علی المحب محرم

او ناصح! تو مجھے رونے دے، چپ رہنا عاشق پر حرام ہے۔

من بات مثلی فھو یدری خلیلتی   طول اللیالی کیف بات متیم

جو شخص میری طرح رات گذارے وہ البتہ سمجھ سکتا ہے کہ عاشقوں کی رات کس طرح گذرتی ہے

اعجاز خسروی میں، عربی زبان میں خطوط لکھے ہیں، جن سے اُنکی عربیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ان میں قافیہ بندی اور لغو تکلفات ہیں، لیکن یہ اُس زمانہ کا عام انداز تھا، تنہا ان پر الزام نہیں آسکتا۔

وان انا الا من غزیۃ ان غوت   غویت وان ترشد غزیۃ ارشد

میں بہرحال قبیلہ غزیۃ کا آدمی ہوں، غزیۃ گمراہ ہے تو میں بھی گمراہ ہوں اور وہ ٹھیک راستہ پر ہے تو میں بھی ہوں۔

صنایع وبدایع امیر صاحب نے صنائع وبدائع میں جو زور آوریاں صرف کیں، اگرچہ کوہ کندن وکاہ برآوردن ہیں، لیکن اس لحاظ سے کہ انکی محنت بالکل رائیگاں نہ جانے پائے، اُنکا اجمالی تذکرہ کرنا ضرور ہے۔

ان میں بہت سی صنعتیں وہ ہیں جو عربی میں موجود تھیں، لیکن فارسی میں انکا ادا کرنا اسلیے مشکل تھا کہ فارسی زبان کی کم وسعتی اسکی متحمل نہیں ہوسکتی، مثلاً صنعتِ منقوطہ یعنی عبارت میں ایسے الفاظ لانا جن کا ایک ایک حرف نقطہ دار ہو، امیر صاحب نے اس قسم کی صنائع میں صفحے کے صفحے لکھے ہیں بعض فارسی میں تھیں، لیکن ایک آدھ سطر سے زیادہ کوئی شخص نہ لکھ سکا، امیر صاحب

نے ورق کے ورق لکھے۔ بعض صنائع میں اُنھوں نے تصرفات کیے، اور بعض بالکل خاص انکی ایجاد ہیں، چنانچہ ہم اُنہی کو مختصر طور پر لکھتے ہیں۔

دو رُو، یعنی ایسی عبارت لکھنی کہ نقطوں کے رد و بدل سے دو مختلف زبانوں میں پڑھی جا سکے اور با معنی ہو۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں کئی صفحے لکھے ہیں، لیکن کاتبوں کی غلط نویسی سے انکا صحیح پڑھنا ناممکن ہے اسلیے صرف ایک آدھ سطر پر اکتفا کرتا ہوں۔

رسیدی۔ بدیدی مرادی بجانے　　زمانے بباشی، بیاری بتائی

اس شعر کو اگر فارسی میں پڑھیں تو اسکا لفظی ترجمہ یہ ہے "کل تو آیا اور تو نے مجکو ایک مکان میں دیکھا، ایک ذرا ٹھیر جا، تو دوستی کرنے کے قابل ہے"۔ لیکن اگر اسی کو عربی میں پڑھیں تو یوں پڑھ سکتے ہیں،

رشیدی، ندیدی، مرادی نجاتی　　زمانی یباس تبادی نسائی

"تو میرا ہدایت یافتہ ہے، بے نظیر ہے، میری مراد ہے، میری نجات ہے، مجکو اس بات نے ناامید کیا کہ عورتیں باہم لڑتی ہیں"

قلب اللسانین، بہت اشعار لکھے ہیں کہ فارسی میں ہیں لیکن اگر اُن کو اُلٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بنجائے۔ مثلاً

بسی باکامرانی درجہان باش،
می باش بکار شادمانی،
باہی یار ما کہ کار می کنیم ہم،
دوست ما یار ہمی بہ یاری ما آئی،

بکن داد و بکشور کامراں باش،

ان تمام مصرعوں کو اُلٹ کر پڑھیں تو عربی عبارت بنجاتی ہے۔

وصل الحرفین۔ یہ وہ صنعت ہے کہ جس قدر الفاظ عبارت میں آئیں ان میں کہیں کوئی حرف الگ نہ آئے، بلکہ دو دو، یا تین تین حرف کا لفظ ہو، مثلاً

چاکر خاصہ، حاجی شرقانی، سرخدمت، بر پایت می مالد، ومی گوید،
کہ بدیں جانب خاطر ما با فرحت قرین می باشد باید کہ گہ گہ جانب ما نامہ
فرماید، تا ہر خوشی کہ براست فرخی کامل یابد۔

یہ اُس صنعت کا نقیض ہے۔ جبکہ ہر لفظ الگ الگ حرفوں میں لکھا جاتا ہے، مثلاً

بر، دور، وداد، آورد، روداد، دارای، داری، دوار، ذات
داور، دوراں را، الخ۔

امیر صاحب نے اس صنعت پر کئی صفحے کی عبارت لکھی ہے۔

ادبعۃ الحروف، اس صنعت پر امیر صاحب کو بہت ناز ہے۔ کئی کئی سطروں کی بامعنی عبارت لکھی ہے، اور یہ التزام کیا ہے کہ صرف چار حروف یعنے الف، ہ، واؤ، یہ، کے سوا اور کوئی حرف نہ آنے پائے، یعنی تمام الفاظ صرف انہی حرفوں سے بنے ہیں، لیکن جو عبارت لکھی ہے، وہ بالکل مہمل معلوم ہوتی ہے اور اسکا پڑھنا سخت مشکل ہے۔

معجزۃ الالسنۃ والشفا، اس صنعت پر بھی انکو ناز ہے، اس میں ایسے الفاظ جمع کیے ہیں کہ سطروں کی سطریں پڑھتے جاؤ، لیکن کہیں ہونٹوں کو جنبش نہیں ہوگی، صرف حلق سے تمام الفاظ نکلیں گے۔

ترجمة اللفظ، یہ صنعت بھی خاص انکی ایجاد ہے، اس میں یہ التزام ہے کہ جو لفظ آتا ہے، اُسکے بعد کا لفظ، دوسری زبان کے لحاظ سے پہلی لفظ کا ترجمہ ہو جاتا ہے
مثلاً سودای رخ تو کُشت مارا،
یہ فارسی مصرع ہے۔ لیکن کشت کا اگر اُردو میں ترجمہ کریں، تو "مارا" ہوگا اسلیے مصرع کا اخیر لفظ پہلے لفظ کا ترجمہ بھی ہے۔ امیر صاحب نے اس صنعت میں پورے صفحہ بھر کی عبارت لکھی ہے۔

محتمل المعانی، ایک شعر میں ایک لفظ لائے ہیں کہ اُسکے سات معنی ہیں اور ہر معنی وہاں مراد لیے جا سکتے ہیں۔

موقوف الآخر، ایک رباعی لکھی ہے، جس کا ہر قافیہ، دوسرے مصرعہ کے آغاز کا محتاج رہتا ہے۔ مثلاً

در حُسن ترا، کسے نماند اِلاَّ   خورشید کہ ہر صبح برون آید، تا
خدمت کند و پاے تو بوسد، اماّ   بینی تو بسوی او، چو پا بوسد، تا

انہی صنعتوں اور ہیجا کاوشوں میں کئی جلدیں لکھ ڈالی ہیں۔ اگر کسی صاحب کو امیر صاحب سے زیادہ مغز کاوی مقصود ہو تو اعجاز خسروی موجود ہے مطالعہ فرمائیں ؛

مطبوعات الناظر پریس لکھنؤ

قواعد اُردو - اردو زبان کی سب سے پہلی جامع
مبسوط اور با اصول قواعد - از مولوی عبدالحق
بی اے سکرٹری انجمن ترقی اُردو - قیمت ۱۲ر

محاربات صلیبی - صلیبی لڑائیوں کے حقیقی حالات
جو اُنکی ایک مسیحی جماعت نے شائع کیے اور باوجود
مذہبی تعصب کے مسلمانوں کی اولوالعزمیوں کا
اعتراف کیا ہے - قیمت عہ

الاحسان - تصوف کی تاریخ اور اسکی درجہ بدرجہ
ترقی کے حالات - قیمت ۸ر

میلاد ابن جوزی - آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم
کی ولادت باسعادت کے متعلق بہترین کتاب ہے
جس میں کمال انشا پردازی کے ساتھ تمام واقعات صحیحہ
بیان ہوئے ہیں - اصل عربی کے ساتھ اُردو ترجمہ
بھی قابل دید ہے - قیمت ۱۲ر

واقعات کربلا - میر انیس کے ایک ہی بحر کے
مرثیوں کا انتخاب ایسے تسلسل کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے
کہ ابتدا سے انتہا تک کل مناظر آنکھوں کے سامنے
پھر جاتے ہیں - قیمت عہ

تسخیر فرانس - شیکسپیر کے مشہور ڈرامے ہنری
دی ففتھ کا اردو ترجمہ - اُردو انشا پردازی کا
بہترین نمونہ - قیمت ۸ر

حیات نظامی - مولانا نظامی گنجوی مصنف
سکندر نامہ کے حالات زندگی قیمت ۱۲ر

کلیات نعت - فدائے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)
حضرت محسن کاکوروی کا مقبول عام کلام - قیمت عہ

تذکرہ حزیں - شیخ علی حزیں مشہور فارسی شاعر
کی سوانح عمری - قیمت ۱۲ر

ترقی زبان بذریعہ تراجم - پروفیسر گوشال
ایم اے کا وہ قابل قدر لکچر جو صاحب موصوف نے
اُردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ میں پڑھا تھا قیمت ۱۲ر

زود پشیماں - اُردو میں اپنے طرز و انداز
کا سب سے پہلا اور دلچسپ ڈراما - اسکی ابتدا میں مولانا
شرر، مرزا رسوا ایل ایل بی، مولوی سید سلیمان ندوی اور مسٹر سجاد حیدر یلدرم
کی تقریظات پڑھنے کے قابل ہیں - قیمت ۸ر

جمیل و جمیلہ - عرب کی سرزمین پر حسن و عشق کی چمن بندی دیکھنا ہو تو مولوی جواد علیخاں جیسے ادیب کا یہ دلچسپ ڈراما دیکھیے - قیمت ۸ر

شو کیا درد و مظلوم بہنیں - ایک دردانگیز فسانہ از جناب قیصر بھوپالی - قیمت ار

ساوات - سٹر جوش کا بےنظیر فسانہ قیمت ار

اتفاقات زمانہ - سٹر موصوف کا دلچسپ فسانہ - ار

مسکفرن اور لوسی - منشی احمد علی شوق قدوائی کا ایک پُرلطف ڈراما - قیمت ار

رموز فطرت - علم طبیعات - طبقات الارض جغرافیہ طبعی اور ثوابت و سیارے کے ابتدائی اور بنیادی اصول کی تشریح مکالمہ کے پیرایہ میں - مع فرہنگ اصطلاحات - قیمت ۱۲ر

انسان - انسان کی تشریح علمی رنگ میں مگر نہایت سلیس اور آسان کہ بچے بھی سمجھ سکیں - ۸ر

ازواج الانبیاء - آنحضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا دیگر انبیا علیہم السلام کی ازواج مطہرات کے حالات - قیمت ۱۲ر

اصول نسخ - لکھنؤ کے مشہور خوشنویس منشی حامد علی صاحب مرصع رقم مرحوم نے اپنی ساری عمر کی مشق و تجربہ کی بنا پر اس کتاب میں وہ اصول اور طریقے لکھدیے ہیں جن سے نو مشقوں کو خط نسخ حاصل کرنے اور اس میں کمال پیدا کرنے میں آسانی ہو - اصولاً و عملاً ہر طرح یہ اس فن کی ایک جامع، مستند اور کار آمد کتاب ہے - قیمت ار

اسرار رنگون - ملک برہما اور رنگون کے اصلی اور سچے حالات - باشندگان رنگون کی معاشرت اور مذاق کے مناظر - حسن و عشق کی جیتی جاگتی تصویریں - شروع سے آخر تک اسقدر دلچسپ کہ بے ختم کیے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا - زبان سلیس - پیرایہ بیان دلکش - قیمت باینہمہ خوبی بہت کم - صرف عہ

محبت اور جاہ و ثروت کی کشمکش - ایک نہایت ہی پرلطف اور سبق آموز افسانہ قیمت ۸ر

تاریخ ہند کی کہانیاں - دلی کی ایک شہزادی نے نہایت ہی سلیس اور دلکش زبان میں یہ کہانیاں اس غرض سے لکھی ہیں کہ لڑکوں اور لڑکیوں میں اسکے ذریعہ سے تاریخی مذاق پیدا ہو - قیمت ۸ر

ملنے کا پتہ :- الناظر ایجنسی لکھنؤ